تجھ سا کہیں کسے

مرحوم سید محمد افضل صاحب، سابق رجسٹرار علی گڑھ

از پروفیسر پرویز طالب
(شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن)

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

افضل بھائی (جناب سید محمد افضل، علی گڑھ کے مایۂ ناز طالب علم، سابق رجسٹرار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، رکن آئی. پی. ایس ۱۹۹۰ء بیچ) گزر گئے اور ساتھ چھوڑ گئے یادوں کا ایک ہجوم جو ۴۰ ؍سال کے طویل تعلق کو محیط ہے۔ یادیں یلغار کر رہی ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ جیسے جھرنے کے نیچے کھڑے ہوکر اوک سے پانی پینے کی کوشش کی جائے۔ مشکل یہ بھی آن پڑی ہے کہ سلسلۂ کلام کہاں سے شروع کیا جائے۔ مناسب ہوگا کہ بات اس وقت سے کی جائے جب تعلق کا آغاز ہوا۔

میں بحیثیت طالب علم ۱۹۸۰ء کی دہائی میں علی گڑھ داخل ہوا۔ بڑے بھائی زمین ہموار کر چکے تھے۔ ہمارے والد بھی پرانے علیگ تھے۔ ان کی ایما پر وہ دو سال پہلے یہاں آکر پیر جما چکے تھے۔ اس سے مجھے بھی خاصی سہولت ہوگئی۔ اس سہولت کا ایک پہلو یہ تھا کہ بھائی صاحب کے احباب کی شکل میں بڑے بھائیوں کا ایک بھر پور حلقہ مجھے میسر آ گیا جو ہر وقت میری سرپرستی، تربیت اور کبھی کبھار بیگاری والے کام لینے کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ افضل بھائی اس حلقے کا اہم حصّہ تھے۔

افضل بھائی سے مجھے خاص فیض یہ پہنچا کہ میں علی گڑھ کی ادبی دنیا سے روشناس ہوگیا۔ وہ اس حلقے میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ ان کا زورِ بیان ہم لوگ مبہوت ہوکر سنتے اور خواہش کرتے کہ ہم بھی اسی روانی سے اپنی بات کہہ سکیں۔ یو. پی بورڈ کے طالب علم کا حال علی گڑھ آنے پر لسانی اعتبار سے خاصا پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ ہندی میڈیم کا پڑھا ہوتا ہے مگر علی گڑھ آ کر اس سے واسطہ نہیں رہتا۔ اردو کی شد بد اس پر منحصر رہتی ہے کہ گھر کا ماحول اس کے لیے کتنا سازگار تھا۔ انگریزی میں بھی ہاتھ تنگ ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں زبان و بیان کا وہ انداز، جو افضل بھائی کا طرۂ امتیاز تھا، حاصل کرنا خاصہ دشوار کن مرحلہ لگتا تھا۔ افضل بھائی ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جہاں، اور خوبیوں کے ساتھ، زبان و بیان کی تربیت پر خاصی توجہ دی جاتی ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ افضل بھائی کا ہی بیان ہے ایک روز ہم نے اپنے والد صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کی نسل کی سوچ اور رکھ رکھاؤ میں جو گہرائی ہے وہ ہماری نسل میں کیوں نہیں؟ فرمایا کہ تم لوگ سیاہی سے لکھتے ہو، ہم لوگ روشنائی سے لکھتے تھے۔ امین بھائی (افضل بھائی کے سب سے بڑے بھائی، سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اور صدر، البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی، علی گڑھ) بتاتے ہیں کہ ایک بار دادا (سید آلِ عبا آوارہ، جن کی ادبی استعداد کا اعتراف مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب اور پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب بھی کرتے تھے) کی سخت تنبیہ کا سامنا کرنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ سوراخ کی جگہ لفظِ 'چھید' استعمال کرلیا تھا۔ اشرف بھائی (ان کے بڑے بھائی، سید محمد اشرف، رکن۔ انڈین ریونیو سروس، جو کچھ ہی وقت پہلے اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں) کو ساہتیہ اکیڈمی کے انعام سے نوازا گیا۔ اس خوشی میں جو تہنیتی جلسہ کنیڈی کامپلیکس میں منعقد ہوا اس میں امین بھائی نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میرے دادا نے اشرف سے کچھ معلومات طلب کیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ''پتہ نہیں''۔ ایک زنّاٹے دار تھپڑ سے نوازنے کے بعد گویا ہوئے کہ میں کسی کا پتہ پوچھ رہا ہوں کیا؟ یہ نہیں کہا جاتا کہ ''معلوم نہیں''۔ امین بھائی کا ہی بیان ہے کہ طلسم ہوشربا اور دیگر کلاسیکی ادب ہم سے پڑھوا کر سنتے۔ پہلی غلطی کی نشاندہی ''اونھ'' سے کر دیتے۔ دوسری غلطی پر یہ ''اونھ'' طویل ہو جاتا اور تیسری غلطی پر ہم تھپڑ کے حق دار پائے جاتے۔ جس شخص کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہو اس کی سرپرستی میرے لیے میل کا پتھر ثابت ہوئی۔

علی گڑھ قیام کا میرا تیسرا سال تھا۔ آفتاب ہال میں ایک مباحثے کا انعقاد ہوا۔ ضابطے کے مطابق تینوں زبانوں میں الگ الگ مقابلہ ہونا تھا۔ افضل بھائی نے آمادہ کیا کہ میں ہندی زبان کے مباحثے میں حصہ لوں۔ میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ اطلاع دی کہ اس سیکشن میں ابھی دو ہی شرکاء ہیں۔ تیسرے شریک تم ہوگے۔ یعنی انعام پکّا ہے۔ بات سمجھ میں آئی۔ مقابلہ Extempore تھا۔ وہیں جلدی جلدی انہوں نے کچھ مواد فراہم کیا۔ ہمت کر کے اسٹیج پر پہنچ گیا۔ مگر زیادہ دیر ٹک نہ سکا۔ پیروں نے جواب دے دیا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے واپس آ گئے۔ خیر! شروعات ہوگئی۔ اس کے بعد افضل بھائی نے مشورہ دیا کہ تم ابھی Set Debate میں حصہ لو۔ وہ تیار کروا دیتے۔ میں رٹ لیتا اور الٹ آتا۔ آہستہ آہستہ خود اعتمادی بڑھی۔ ان جیسا کمال تو نہ حاصل ہو سکا، مگر اسٹیج کی جھجھک نکل گئی۔ اور وہ تو اس فن کے بے تاج بادشاہ ثابت ہوئے۔ کئی بار یونیورسٹی کی نمائندگی کی اور دوسری جامعات میں بھی علی گڑھ کا نام روشن کیا۔

پھر انہیں میرے اس وصف کا اندازہ ہوا کہ مجھے اشعار بہت یاد ہیں۔ مجھے یہ شوق ورثے میں اپنی والدہ سے حاصل ہوا ہے۔ میری امّی ماشاءاللہ اشعار کا ذخیرہ ہیں۔ موقع کی مناسبت سے اشعار کہنا ان کا خاص ملکہ ہے۔ اس پس منظر میں انہوں نے مجھے بیت بازی کی طرف آمادہ کیا۔ وہ خود بھی اس میں شرکت کرتے، حالانکہ ان کا اصل میدان تقاریر ہی رہا۔ اس کا نتیجہ خاصا مثبت نکلا۔ میرے اشعار کا اثاثہ بڑھتا گیا اور وہ وقت بھی آیا کہ جب مجھے بیت بازی کے انٹر ورسٹی مقابلے میں اپنی یونیورسٹی کی نمائندگی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ جب میں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا وہاں بھی اس اثاثے سے خوب فیض حاصل ہوا۔

شعر فہمی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اس کی وجہ ان کا لسانی ذوق تھا، میری اردو میں استعداد بس واجبی تھی۔ تھوڑی شد بد امّی کی تربیت کا ثمرہ تھا۔ اس لیے اکثر اشعار کے انتخاب میں، یا ادائیگی میں کمی رہ جاتی تھی۔ وہ بغیر دل شکنی کی نشاندہی کر دیتے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک شعر ان کی خدمت میں ارسال کیا۔ شعر تھا ؎

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

جواب آیا کہ پہلا لفظ سوز ہوتا تو کیا ہی بات ہوتی، اور سوز کے معنی ہیں دل کی جلن۔ پھر اس غزل کا مقطع بھی سنایا۔

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

تربیت کا یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری ایّام تک جاری رہا۔ وہاٹس ایپ کے ذریعے اپنے منتخب کردہ اشعار سے ان کی چاند ماری کرتا۔ تقریباً روز کا معمول تھا۔ اگر ان کی سند مل جاتی تو اپنے انتخاب پر اطمینان ہو جاتا۔ ایک بار پروین شاکر کا یہ شعر ان کی خدمت میں پیش کیا ؎

یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

خاصا پسند فرمایا اور لکھا کہ کیا بامعنی شعر ہے۔ کبھی کوئی غیر معیاری شعر ان تک پہنچ جاتا تو بھی کہہ دیتے۔ ایک بار ایسا ہی ہوا تو میں نے جواز پیش کیا۔ عرض کیا کہ یہ اشعار میں ایک پورے گروپ کو بھیجتا ہوں۔ اردو کی استعداد اب کم لوگوں میں ہے۔ ان میں ذوق پیدا کرنے کے لیے کچھ عام فہم اشعار کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ ناراض ہوئے اور کہا کہ معیار کا خیال رکھو۔ مولوی قمرالدین کے نواسے ہو۔ بدایوں کا پس منظر ہے۔ تمہاری ذمّہ داری زیادہ ہے۔ پھر شکیب جلالی کی غزل ارسال کی۔ ساتھ میں لکھا کہ پرویز، دیکھو غزل اسے کہتے ہیں۔ ایک ایک شعر موتی کی طرح ہے۔ غزل کچھ یوں تھی ۔

کیا جانیے منزل ہے کہاں جاتے ہیں کس سمت
بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں
بھیگی ہوئی اک شام کی دہلیز پہ بیٹھے
ہم دل کے سلگنے کا سبب سوچ رہے ہیں
ٹوٹے ہوئے پتوں سے درختوں کا تعلق
ہم دور کھڑے کنج طرب سوچ رہے ہیں
بجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں ہے سرِ محفل
کیا رنگ جمے آخرِ شب سوچ رہے ہیں
اس لہر کے پیچھے بھی رواں ہیں نئی لہریں
پہلے نہیں سوچا تھا جو اب سوچ رہے ہیں

علی گڑھ کا ایک خاصہ یہ ہے کہ اس میں الگ الگ انداز کے رنگ پنہاں ہیں۔ میرا ایک گروپ سے تعلق تھا جو لیک سے ہٹے موضوعات منتخب کرتا تھا اور ان پر مذاکرہ منعقد ہوتا۔ طبیہ کالج کے لائق و فائق استاد ڈاکٹر عبدالمتین صاحب، جنہوں نے اپنی زندگی وہاں مدارس کے پس منظر سے آئے طلبہ میں انگریزی کی استعداد بڑھانے میں وقف کردی، اس گروہ کے روح رواں تھے۔ موضوع دل چسپ اور چٹخارے دار ہوتے۔ مگر ان کے علمی معیار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بزرگ استاد مرحوم اسلوب احمد انصاری صاحب ان مذاکروں کی صدارت فرماتے۔ ان کے گزر جانے کے بعد یہ ذمّہ داری پروفیسر مسعود الحسن صاحب اور پروفیسر فصیح احمد صدیقی صاحب نبھاتے رہے۔ شرکاء میں پروفیسر یوسف امین، پروفیسر یاسین مظہر صدیقی، پروفیسر ابو الکلام قاسمی، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر مودود اشرف، پروفیسر عبدالباری، ڈاکٹر ذکی کرمانی، حبیب الرحمان چغانی صاحب، ڈاکٹر ایف. ایس. شیرانی، وغیرہ، پیش پیش رہتے۔ کیا کیا نادر موضوعات ان مذاکروں کے لیے تجویز ہوئے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ 'جہالت کے فوائد'، 'کیا عورتیں مردوں کا جذباتی استحصال کرتی ہیں'، 'ہر گرگ کو ہے برّہ معصوم کی تلاش: ذمہ دار کون گرگ یا برّہ معصوم' وغیرہ۔ یاد آتا ہے کہ ایک بار موضوع تجویز ہوا 'فکری دیوانگی: قوموں کی ترقی کے لیے لازمی عنصر'۔ کیا گرما گرم بحث رہی۔ مباحثے کا اختتام اسلوب صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں، اس شعر سے کیا ۔

اک جنوں ہے جو با شعور بھی ہے
اک جنوں ہے جو با شعور نہیں

ہم لوگوں کی کوشش ہوتی کہ افضل بھائی کے برادر بزرگ اشرف بھائی کی بھی اس محفل میں شرکت ہو۔ بحیثیت انکم ٹیکس کمشنر ان کا قیام خاصے وقت علی گڑھ میں رہا۔ وہ ان محفلوں میں کبھی کبھی شریک بھی ہوئے اور مذاکرے کے معیار میں اضافہ فرمایا۔ ابھی افضل بھائی کی علالت کے دوران ملاقاتیں رہیں۔ وہ اس بات پر افسوس کر رہے تھے کہ تم لوگوں نے ان مذاکرات کی ریکارڈنگ نہیں کی۔ یہ ایک بے حد قیمتی علمی سرمایہ ہوتا۔ افضل بھائی کا اپنی ملازمت کے چلتے قیام علی گڑھ میں نہ تھا۔ جب بحیثیت رجسٹرار کچھ وقت یہاں آئے بھی تو ایسی گوں ناگوں مصروفیات رہیں کہ شرکت نہ ہو پائی۔ مگر موضوع کے انتخاب میں، میں اکثر ان کی رائے لیتا۔ ایک بار عبدالمتین صاحب نے موضوع تجویز کیا اور شرکاء کی رائے جانی۔ موضوع تھا ''صحت مند معاشرے کے لیے فضول باتوں کی افادیت'' میں نے یہ موضوع ان تک پہنچایا اور ان کی رائے جانی۔ سوال پوچھا کہ ''فضول باتوں سے کیا مراد ہے؟'' وضاحت میں میں نے لکھا کہ وہ باتیں جو کام کی نہ ہوں۔ جو ہم لوگ آفتاب ہاسٹل کے فوّارے کی منڈیر پر بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ خاصے محظوظ ہوئے اور کہا کہ بہت مناسب موضوع ہے۔ مذاکرے کے لیے بالکل منتخب کرو۔

عرضِ مدعا یہ ہے کہ بھرپور اور لگاتار تربیت کی۔ دراصل وہ جس سے تعلق رکھتے تھے کوشش کرتے کہ وہ اپنی خودساختہ حدوں سے باہر نکلے۔ اس میں ایک رول ان کی اپنی ذات کا ہوتا۔ ہم لوگ، ناکام ہی سہی، پُرکوشش کرتے کہ ان کا سا کمال حاصل کر سکیں۔ ہاسٹل کے قیام کے دوران اور اس کے بعد بھی کیسی کیسی نایاب کتابوں سے تعارف کرایا۔ آگ کا دریا، خاک و خون، خدا کی بستی، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں، وغیرہ انھیں کی ایماء پر پڑھیں۔ بلکہ مہیا بھی انہوں نے ہی کرائیں۔ مشتاق یوسفی کے تو وہ حافظ تھے اور ان کے اقتباسات سے محفل میں رنگ جما دیتے تھے۔ ان کی علمی استعداد کا اندازہ ان کی طالب علمی کے زمانے کی غزل سے کیا جا سکتا ہے۔ پس منظر یہ تھا۔ مجھے وہ اپنے مخصوص ذاتی معاملوں میں راز دار بنا لیتے تھے۔ جیسے میں نے اوپر عرض کیا کہ میرا شمار خوردوں میں تھا۔ اور اکثر بڑوں کی بیگاری والے کام میرے ذمے آتے۔ جیسے بڑوں کی محفل جمی ہے تو مجھے چائے بنانے کے لیے طلب کیا جاتا۔ افضل بھائی کو چائے سے کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ کبھی کبھار مجھ سے ایلچی کا کام لیتے۔ ایک دن علی الصبح میرے آفتاب ہاسٹل کے کمرے تشریف لائے۔ آنکھیں شب بیداری سے لال تھیں۔ کہا کہ ایک غزل سنو۔ رات لکھی ہے......

جو تمام سدھ بدھ میری سرے سے بھلا گیا ہے
ہے کون وہ جس نے میرے دل میں اگائے جذبوں کے نرم پودے
ہے کون وہ جو مرے خیالوں میں اتنا گہرا سا گیا ہے
وہ جس کی آنکھوں کی جوت بھر دے مرے خیالوں میں روشنی سی
ہے کون وہ جو وجودِ خاکی کو میرے نوری بنا گیا ہے
اگر مجھے اس کی ملتی قربت بناتا ناکامیوں کو نصرت
ہے کون وہ ہجر جس کا میرے تمام منصوبے ڈھا گیا ہے
نہ جانے اب ہو چکا ہے کس کا مجھے تو یہ بھی خبر نہیں ہے
وہ میرا ہم دم وہ میرا مونس بچھڑ کے مجھ سے کہاں گیا ہے
بہت ہی کوشش کے بعد تم کو بھلا رہا تھا مگر کروں کیا
تمہارا ہم نام ایک چہرا تمہاری یادیں دلا گیا ہے
یہ سخت گرمی کی تیز لپٹیں، یہ تیز سردی کی برف راتیں
یہ موسموں کی تمام شدّت، ترا تصوّر مٹا گیا ہے
یہ تیرے ماتھے کا نور میری اندھیری راہوں میں روشنی تھا
مگر کسی اجنبی کے ہاتھوں میں اس کا قبضہ چلا گیا ہے
نہیں مجھے علم اس کا جاناں کہ کر دیا میں نے خود کو کیا کچھ
تو سن لے اتنا کہ ساتھ تیرا بھرم مرا سب مٹا گیا ہے
چلو کہ رکھتے ہیں ہم قلم کو صبح کی آمد بھی ہو رہی ہے
کہ لکھتے لکھتے ترا تصور ہمیں ذرا سا رلا گیا ہے

بہت کم ایسا تسلسل لمبی بحر کی غزل میں دستیاب ہے۔ انہوں نے بعد میں کچھ افسانے اور خاکے بھی لکھے۔ خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی اس لیاقت کو اور بروئے کار لاتے تو کہنہ مشق ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا۔ خیر یہ تو کہنے کی بات ہے۔ انسان وہی بن پاتا ہے جو اس کی ذاتی سرشت کے مطابق ہو اور جس کے لیے وہ باقاعدہ مشق اور عرق ریزی کرے۔ ان کا مسلک خدمتِ خلق تھا اور وہ افراد کی اس قبیل سے تھے جو اپنے مذہب سے زیادہ مسلک کے پابند ہوتے ہیں۔

ایک واقعہ کا ذکر کرتا چلوں۔ اس سے ان کے علی گڑھ سے تعلق کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور حسب مراتب کو درکنار کر خلقِ خدا کی مدد کی سرشاری بھی نمایاں ہوتی ہے۔ علی گڑھ میں ایک ریڑھی لگانے والے شخص کا انتقال ہو گیا۔ گزرتے وقت اس نے اپنی جوان بیٹی کی ذمہ داری ان صاحب کے حوالے کی جو اس واقعے کے راوی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ لڑکی نیک اور خوش شکل تھی۔ ایک لڑکے کے جھانسے میں آ گئی اور اس سے نکاح کرلیا۔ یہ صاحب زادے مدھیہ پردیش کے شہر شِو پوری کے تھے اور انڈسٹریل اسٹیٹ میں کسی فیکٹری میں ملازم تھے۔ ایک بچے کی ولادت بھی ہوگئی۔ جب دوسرے بچے کی ولادت کا وقت آیا تو ان صاحب زادے کے گھر والوں نے انہیں اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے دباؤ بنایا۔ قوی امید تھی کہ یہ صاحب اس کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جاتے۔ اس لڑکی کے سرپرست کی کچھ واقفیت ڈاکٹر عاصم رضوی صاحب کے حوالے سے افضل بھائی سے تھی۔ انہوں نے اس تعلق سے

ان سے رجوع کیا اور لڑکی کی مدد کی گہار لگائی۔ اپنے مزاج کے مطابق انہوں نے فوراً گھوڑے چھوڑ دیے۔ بیچ بچاؤ ہوا۔ لڑکے کے خاندان والوں کو اندازہ ہو گیا کہ اب آسانی سے نہ نکل پائیں گے۔ مگر ان کی بھی سمجھ میں آ گیا کہ معاملہ زیادہ دن چل نہیں پائے گا۔ بعد میں لڑکی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ معاہدے میں انہوں نے لڑکی کو اتنی خطیر رقم دلوا دی جس سے اس کا علی گڑھ میں مکان تعمیر ہو گیا۔ جہاں وہ اپنی اولاد کے ساتھ گزر بسر کر پا رہی ہے۔

ان کے اس وصف کی وضاحت ان کی بیچ میٹ محترمہ انورادھا شنکر سنگھ نے بھی کی۔ یہ ان کے ساتھ بحیثیت ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل، بھوپال میں مقیم تھیں۔ بھوپال میں منعقد ہوئے تعزیتی جلسے میں رندھے سے گلے سے بھاؤ بھینی شردھانجلی دی اور انکشاف کیا کہ جب افضل کو اپنی مہلک بیماری کا اندازہ ہو گیا تو انہوں نے اس کی سنجیدہ تیاری شروع کر دی۔ ان کا بیان ہے کہ اپنے بچوں کے ساتھ ان لوگوں کی فکر میں لگ گئے جو ان سے امید لگائے رہتے تھے۔ انہوں نے تقریباً ایسے ۲۰۰ر معاملے انہیں نوٹ کرائے، اس درخواست کے ساتھ کہ ان کو اب تم دیکھ لینا۔ ایک پوری فائل تیار ہو گئی۔ اور یہ لوگ صرف پولس محکمے سے تعلق رکھنے والے نہیں تھے۔ دنیا بھر کے چھوٹے چھوٹے مسائل تھے۔ کسی کا زمین کا معاملہ تھا۔ کسی کی نوکری کا مسئلہ تھا۔ کسی کا گھر میں کسی سے جھگڑا تھا۔ یہ احتجاج کرتی رہ گئیں کہ تم کہیں نہیں جا رہے ہو، ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔

انہوں نے ان کا علی گڑھ سے تعلق بھی بیان کیا۔ اسی بیماری کے دوران انہوں نے فون پر شکایت کی کہ تم علی گڑھ جا کر کیوں بیٹھ گئے۔ ٹھیک سے خیریت بھی نہیں مل پاتی۔ تو انہوں نے اس کی وجہ بیان کرنے کے لیے مجاز کی علی گڑھ کے ترانے والی نظم کے کچھ حصے ارسال کیے۔

فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں

اور اس کا یہ حصہ بھی لکھ بھیجا۔

اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک سے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی پروین سے رشتے جوڑے ہیں

ساتھ میں یہ بھی وضاحت کی کہ ناہید اور پروین سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، یہ دونوں مجاز کی تراشیدہ ہیں، تم راشدہ (بیگم افضل مرحوم) کو غلط سلط پٹی نہ پڑھا دینا۔

ایک بار وائس میسیج بھیجا۔ ایک بات کہوں، برا مت ماننا۔ وہ یہ کہ تمہارے گھر میں جیسی ناقدری ٹیلنٹ کی ہوئی ہے، ہمارے خیال میں کہیں نہ ہوئی ہوگی۔ خواہ وہ تمہاری امی کا ٹیلنٹ ہو یا تمہاری بھتیجی کا، رائیگاں چلا گیا۔ شمیم بھائی (میرے بہنوئی، رکن-انڈین ایڈمینسٹریٹو سروس) نے امی کی ایک کلپ بھیجی ہے۔ میں ان کی آواز سن کر وجد میں آ گیا۔ کاش انہیں موقع ملا ہوتا تو وہ عالم گیر شہرت کی مالک ہوتیں۔ اور ایسے ہی جاوید (میرے بڑے بھائی، سابق ڈین ، لاء فیکلٹی، اے.ایم.یو) کی بیٹی ہے۔ اگر اسے موقع مل جائے تو وہ عالم گیر شہرت کی مالک ہو سکتی ہے۔ اب اس کے جواب میں تم جو بھی کہو گے پرویز، وہ ڈیفینس تو ہوگا، حقیقت نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں میں نے انہیں اپنی بیٹی کی پڑھی ہوئی نعت کا ایک کلپ بھیج دیا۔ میری چھوٹی بیٹی نعت گوئی کا خاصا شوق رکھتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمتین صاحب، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، ایک سیرت کا جلسہ اپنے گھر پر منعقد کرتے ہیں۔ وہاں اس نے بردہ شریف 'مولای صل و سلم دائما ابداً' پڑھا۔ خاصی داد و تحسین سے نوازی گئی۔ بزرگ استاد پروفیسر مسعود الحسن صاحب، جو میرے والد کے بھی استاد رہے ہیں، اس وقت حیات تھے، وہ بہ نفس نفیس گھر تشریف لائے اور اس کی حوصلہ افزائی کی اور ۱۰۰ر روپے کا انعام دیا۔ میں نے اس کی کلپ جب بھیجی تو ساتھ میں یہ بھی لکھ دیا کہ ایک کیس اور ناقدری کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ خاصے نالاں ہوئے۔ مگر سمجھ گئے کہ اس سے کچھ کہنا فضول ہے۔ یہ اپنی گھر کی روایتوں سے الگ نہیں چلے گا۔ پھر کبھی اس موضوع پر گفتگو نہ کی۔

دراصل صلاحیتوں کے فروغ کی فکر انہیں ہمیشہ لاحق رہتی۔ انتقال کے ایک دن بعد پروفیسر فیضان مصطفیٰ کا فون آیا۔ قارئین کو علم ہوگا کہ وہ NALSAR کے وائس چانسلر ہیں اور قانون کی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ہمارے ہم عصر اور ہاسٹل کے ساتھیوں میں ہیں۔ علی گڑھ قیام کے دوران ان کو بھی افضل بھائی کی سرپرستی نصیب رہی۔ کہنے لگے، علی گڑھ کے ساتھیوں میں سب سے زیادہ فون مجھے افضل بھائی نے کیے۔ عام طور سے یہ فون ان کے کسی مضمون چھپنے کی ستائش میں ہوتے۔ قانون کے پیچیدہ مسئلوں میں ان کی رائے طلب کرتے۔ تعلیمی پس منظر اور پیشہ ورانہ ضروریات کے مدنظر وہ اس کی از خود بھرپور استعداد رکھتے تھے۔ مگر مقصد اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی تھی۔ کبھی کبھی لگتا کہ ہمیں جو اہمیت دے رہے ہیں یہ ہمارا حق بھی ہے! ان کی علی گڑھ کی رجسٹراری کے دوران جسٹس احمدی کو علی گڑھ آنا تھا۔ ان کو لانے کا کام مجھے سونپا۔ تاکید کی کہ تیاری سے جانا۔ طویل ساتھ ہوگا۔ علی گڑھ کی عزت کا سوال ہے۔ ان کے خاص خاص فیصلوں کی نشاندہی کی۔ اور کہا کہ لاء فیکلٹی چلے جاؤ اور یہ فیصلے حاصل کرو اور ان کا مطالعہ کرو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ سفر کے دوران ان کے مشورے کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ جب میں نے ان سے ٹی.این.سیشن سے متعلق ان کے معرکۃ اعلیٰ فیصلے کا ذکر کیا تو وہ کھل گئے۔ فیصلے کے بین السطور میں کیا تھا اس کی وضاحت کی۔ پھر مجھے ایک سبق دیا۔ فرمایا کہ کبھی کسی شخص کو پرکھو تو دو پیمانے پاس رکھو۔ ایک یہ کہ اس میں sense of proportion ہو اور دوسرا یہ کہ وہ sense of propriety بھی رکھتا ہو۔ میں نے اس بات کا ذکر افضل بھائی سے بھی کیا اور عرض کیا کہ یہ حاصلِ سفر رہا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ ایک دہائی گزرنے کے بعد البرکات میں سید حامد کمیونٹی کالج کا افتتاحی جلسہ ہوا۔ چینئی سے فادر زیویر الفانس تشریف لائے۔ سوسائٹی کی نمائندگی ان کو کرنا تھی۔ اس جلسے میں من و عن میرے حوالے سے انسانوں کو جانچنے کے اس پیمانے کا ذکر کیا۔ غضب کی یادداشت کے مالک تھے۔ اور اپنے خوردوں کی حوصلہ افزائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

آج غور کرتا ہوں کہ ان کی کمال شخصیت تھی۔ کیسا پروقار خاندانی پس منظر تھا۔ زندگی میں حاصل کی گئی نمایاں کامیابیاں تھیں۔ ایسے شخص پر تھوڑا بہت غرور خوب سجتا۔ مگر یہ ان کو چھو کر نہیں گزرا تھا۔ اس کے برعکس طبیعت میں عجب عجز و انکساری تھی۔ میرے چھوٹے بھائی نوید طالب (رکن-انڈین انجینیرنگ سروس) کا بیان ہے کہ انتقال سے کوئی تین سال قبل کسی سرکاری کام سے بھوپال سے جھانسی تشریف لائے۔ یہ اپنی ریلوے کی ملازمت کے سلسلے سے وہاں مقیم تھے۔ ناشتے کے دوران اس سے کہا کہ تمہیں اگر ہماری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہو تو ہمیں معاف کر دینا۔ اس پر کیفیت طاری ہو گئی۔ مشکل سے گویا ہوا کہ افضل بھائی، آپ کے چھوٹوں میں ہوں، نہ مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد آتا ہے۔ آپ ایسی بات کیوں کہہ رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ ابھی کچھ مدت گزری ہمارا ایک ساتھی دھرم راؤ گزر گیا۔ اب لگنے لگا ہے کہ کب کس کا وقت آ جائے۔ اس لیے تم سے یہ درخواست کی۔

اس ضمن میں ایک اور وصف کا بھی ذکر کرتا چلوں۔ ایک دفعہ کی بات ہے مجھ سے دریافت کیا کہ علی گڑھ قیام کے دوران، یا اس سے الگ بھی، تمہیں کس کس نے متاثر کیا۔ بہت سے اشخاص اور استادوں کا ذکر آیا۔ کچھ غیر مطمئن نظر آئے۔ میں نے پوچھا، آپ بتائیں۔ کہنے لگے آفتاب ہاسٹل کے امام صاحب یاد ہیں۔ میں نے کہا، ہاں خوب یاد ہیں۔ اپنے مولانا شمس الاسلام صاحب۔ کہنے لگے آج تک ان جیسی بھرپور شخصیت سے واسطہ نہیں پڑا۔ ان کی نشاندہی پر میں نے بھی غور کیا۔ یہ ہمارے آفتاب ہاسٹل میں مؤذن کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اکثر امام صاحب نہ ہوتے۔ یہی نماز بھی پڑھا دیتے۔ ہاسٹل کا ہر مکین ان سے قرب محسوس کرتا۔ ایسے گھلے ملے رہتے کہ لگتا ہمارے خاندان کے ہی کوئی بزرگ ہیں۔ اپنے پاس پانوں کی ڈبیہ، سونف، الائچی وغیرہ کا اہتمام رکھتے۔ وقتاً فوقتاً ان نعمتوں سے ہمیں نوازتے۔ کبھی کسی پر غیر ضروری بوجھ نہ ڈالتے۔ خاصے وقت بعد ہمیں علم ہوا کہ خانگی حالات دشوار کن ہیں۔ اہلیہ محبت کرنے والی تھیں مگر جلد دارِ فانی کو کوچ کر گئیں۔ تین بچوں کی ذمہ داری اور کفالت ان کے کندھوں پر آ گئی۔ مگر کبھی احساس نہ ہونے دیتے کہ ان مشکل مراحل سے گزر رہے ہیں۔ اللہ نے آواز میں ایک ملاحت بخشی تھی۔ یاد آیا کہ ایک بار عشاء کی نماز میں آیت الکرسی کی تلاوت کی۔ رقت طاری ہو گئی

تھی۔ میں نے تبصرہ کیا کہ آپ کی آواز میں عجب کشش ہے۔ کہنے لگے ہاں۔ شاید اسی لیے اللہ نے مجھے حفظ کی نعمت سے نہیں نوازا۔ ورنہ میرے سامنے کوئی ٹِک نہ پاتا۔ اپنی سیادت کی ایک تمکنت بھی رکھتے تھے۔ ملازمت کے آخری ایام میں compassionate ground پر بحیثیت امام تقرر ہو گیا تھا۔ حالاں کہ اس کے لیے حفظ لازمی تھا۔ جب ملازمت سے سبک دوشی ہوئی تو پورے ہاسٹل نے الوداعیہ جلسے کا اہتمام کیا۔ بڑے احترام سے ان کو رخصت کیا۔ میں خوش قسمت تھا، یہیں ملازمت کا انتظام ہو گیا۔ اس لیے بعد تک ان سے تعلق رہا۔ ہم چاروں بھائی بہنوں کے نکاح آپ نے ہی پڑھائے۔ اکثر اتوار کو ہمارے گھر تشریف لاتے۔ میں بڑھ کر سائیکل تھام لیتا۔ کچھ احتجاج کرتے، مگر پھر سمجھ گئے یہ نہ مانے گا۔ آفتاب منزل کی بیگم شہزاد علیم صاحبہ (سرسید علیہ الرحمہ کی پڑپوتی) بھی ان کی معتقد تھیں۔ اگر ملاقات کو وقت گزر جاتا تو ان کو پیغام بھجواتیں کہ آپ کی آمد کی منتظر ہیں۔ افضل بھائی کی نشاندہی پر ان کی پوری شخصیت آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ ان کی مردم شناسی پر بھی رشک ہوا۔ اور واقعہ ہے کہ انہوں نے کبھی انسان کو اس کے عہدے کے تعلق سے نہ گردانا۔ اس کے ہنر اور خوبیوں کا پیمانہ سامنے رکھا۔

ایک اور ایسی ہی باکمال شخصیت کا تعلق ہم دونوں سے رہا۔ احمدی اسکول کے ایک میوزک کے استاد تھے، شمس الدین شیخ صاحب۔ تمام زندگی وہاں کے طلبہ کو اس ہنر سے آراستہ کرتے رہے۔ ایک مثالی استاد کے سارے اوصافِ پسندیدہ رکھتے تھے۔ اس کوشش میں لگے رہتے کہ اپنے طلبہ کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم ہو جائے۔ خود اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ میوزک کے اسرار و رموز کی خوب واقفیت رکھتے تھے۔ میری درخواست پر شامِ غزل کے پروگرام میں ڈپارٹمنٹ تشریف لے آتے۔ ایسی ہی ایک محفل میں انہوں نے ناصر کاظمی کی غزل 'کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں، آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لیں چلیں'، پڑھی۔ سامعین پر کیفیت طاری ہو گئی۔ مجھے احساس رہا کہ یہ باکمال شخص گم نامی کا شکار ہے۔ میں انہیں اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ ایک اسٹوڈیو میں ان کی آواز میں چنندہ غزلوں کی رکارڈنگ کرائی۔ آج بھی وہ میرے لیے ایک بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ فرصت کے اوقات میں اس سے محظوظ ہوتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے یہ کمال کیسے حاصل کیا۔ اپنی پرانی یادوں میں کھو گئے۔ پہلی بار اپنے نابینا ہونے کی دقتوں کا ذکر کیا۔ کہنے لگے کہ میں مدھیہ پردیش کے اندور ضلع سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایک روایتی محلے میں میرا خاندان رہتا تھا۔ ریاض کی کوئی سہولت نہ تھی۔ ہم تین چار ساتھی جو میوزک کا شوق رکھتے تھے انہوں نے شہر سے دور ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ وہاں جا کر ہم لوگ ریاض کرتے۔ چار گھنٹے تو پیدل آنے جانے میں صرف ہوتے۔ ایک دن میں نے کچھ زیادہ وقت ریاض کیا۔ میرے ساتھی، جو بینائی کی نعمت رکھتے تھے اور ان کے ساتھ میرا سفر آسان ہو جاتا تھا، انتظار کر کے نکل گئے۔ مجھے اکیلے واپس آنا پڑا۔ راستے میں ایک چوپائے نے میرے سینگ مار دیا۔ میں نالے میں گر گیا۔ رات بھر وہیں پڑا رہا۔ صبح تقریباً نیم مردہ حالت میں مجھے نکالا گیا۔ مگر ان سب کے باوجود میں نے کبھی ریاض نہ چھوڑا۔ علامہ اقبال کا شعر میری سمجھ میں آیا ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

افسوس کہ افضل بھائی کے انتقال کے اگلے دن یہ بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادے، جو میرے ہمنام ہیں، ان سے ملاقات ہوئی۔ یہ موصوف البرکات میں ایک طویل مدت تک میوزک ٹیچر کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ مجھے گوش گزار کیا کہ افضل صاحب البرکات میں میرے کمرے آ جاتے اور فرمائش کرتے کہ شیخ صاحب کی کوئی تخلیق سناؤ۔

کوئی دو سال قبل میں نے ڈپارٹمنٹ میں لیکچر کے لیے مدعو کیا۔ ویسے تو علی گڑھ آنا ہوتا تو ڈپارٹمنٹ اکثر تشریف لاتے۔ میرے استاد جاوید اختر صاحب اور خالد اعظم صاحب سے ملنے کی خاص خواہش رکھتے۔ مجھے امرود منگوانے کا حکم دیتے۔ اس دن GEC کے اپنے پرانے ساتھی عبد القادر صاحب نظر آ گئے جو آج کل ہمارے شعبہ میں غیر تدریسی عملے کے سربراہ ہیں۔ ان کے لٹریری سکریٹری کی ذمہ داری کے دوران ہی انہوں نے ملازمت کی شروعات کی تھی۔ ہم لوگ GEC میں انہیں One man Army کے لقب سے مخاطب کرتے۔ انہیں دیکھ کر خوش ہو گئے اور کہا کہ تو یہاں کیا کر رہا ہے!

MBA کی کلاس میں مختلف تعلیمی پس منظر کے طلبہ ہوتے ہیں۔ ان کی افتادِ طبع الگ الگ مزاج کی ہوتی ہے۔ رسمی موقع تھا، میں نے انگریزی میں تعارف پیش کیا۔ جب بولنے کھڑے ہوئے تو کہنے لگے زیادہ دیر انگریزی سن کر تھکن ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی بند لگایا کہ آپ کے صدر شعبہ میرے تعارف میں یہ بات گول کر گئے کہ ہم دونوں ایک ہی گھر میں ستائے گئے ہیں۔ میری اور ان کی اہلیہ سگی بہنیں ہیں۔ اور پھر 'زندگی کیسے گزاریں' کے موضوع پر سیر حاصل کلام کیا۔ میرا ایک طالب علم، راہل اپادھیائے جو اس سیشن کا حصہ تھا اس نے ان کے انتقال پر مجھے تعزیتی پیغام بھیجا۔ پیغام انگریزی میں ہے۔ میں اس کے جذبات کی ترجمانی اردو میں کر رہا ہوں:

''افضل سر، ایک غیر معمولی دانائی کے مالک تھے۔ مجھے ان کا ادا کیا ہر لفظ یاد ہے۔ میرے لیے وہ ایم۔بی۔اے کا پہلا سال تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میرے اوپر سخت وقت گزرا تھا۔ میں ذہنی دباؤ میں رہا تھا۔ میں ایک لمبی لڑائی کے بعد ایم۔بی۔اے میں داخل ہوا تھا۔ میرے لیے ان کی باتوں نے ایک ٹانک کا کام کیا۔ اوپر والا ان کی روح کو سکون دے۔''

طالب علم ایسے کامیاب اجلاس کے بعد، مقرر کے اردگرد گھیرا بنا لیتے ہیں۔ سوال و جواب کا سلسلہ رہتا ہے۔ ایک طالب علم نے سوال کیا کہ سول سروس بحیثیت پیشہ کیسا ہے۔ ساتھ میں یہ بھی وضاحت کی میں اسے نہیں اختیار کرنا چاہتا۔ مگر میرے والدین کا اصرار ہے کہ میں یہ پیشہ چنوں۔ انہوں نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا، اور اپنی ذاتی لیاقت اور شوق کے مطابق پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ میں خاصا متعجب ہوا۔ میرے کمرے تشریف لائے تو میں نے اور وضاحت چاہی۔ مجھے امید تھی کہ ملک کے داخلی حالات کو اپنے موقف کی وجہ بتائیں گے۔ کہنے لگے کہ سول سروس انسان کو اندر سے خراب کرتی ہے۔ مجھے یاد دلایا کہ بھوپال کے چار املی کے علاقے میں جہاں بیشتر سینئر سرکاری ملازم مقیم ہیں (جہاں ان کا بھی قیام تھا) میں تمہیں ایک پارک میں لے گیا تھا جہاں پیڑوں کا اتنا گھنا سایا ہے کہ دن میں بھی رات کا گمان ہوتا ہے۔ یہ وہاں کے ان مکینوں کے دماغ کی اپج ہے جو دیر رات تک پارٹی وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں اور پھر اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب سورج شباب پر ہوتا ہے۔ دن کے اس وقت چہل قدمی کے لیے ان حضرات نے یہ باغ تشکیل کیا ہے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ دراصل سول سروس انسان کو بہت کم عمری میں بے انتہا اختیارات اور وسائل مہیا کرا دیتی ہے۔ بہت کم حضرات اس کی تاب لا پاتے ہیں اور اپنا توازن برقرار رکھ پاتے ہیں۔ بیشتر کی اندرونی نشوونما اور ارتقا رک جاتا ہے۔ یاد رکھو، ہر شخص کو سول سروس کا مشورہ دینا کوئی مناسب بات نہیں، الا ان کے جن کا واقعی اس کی طرف رجحان ہو۔

ان کے علی گڑھ سے حد درجہ لگاؤ کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ وہ علی گڑھ کے شیدائی تھے۔ ہر سانس میں علی گڑھ جیتے تھے، ایک واقعہ انہوں نے سید حامد صاحب کے حوالے سے بیان کیا۔ افضل بھائی جامعہ کے رجسٹرار تھے۔ تب ان کو ایک تقریب میں مدعو کیا گیا۔ ان کو لانے کا کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا۔ مقصد تھا کہ ان کے ساتھ کچھ لمحات گزارنے کا موقع نصیب ہو۔ سفر کے دوران ان سے دریافت کیا کہ آپ کی علی گڑھ نے وہ قدر نہیں کی جو آپ کا حق تھا۔ لیکن آج بھی علی گڑھ آپ کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ وہ خاموش ہو گئے۔ کار کے ڈیک میں حبیب ولی محمد کی گائی ایک غزل چل رہی تھی:

آوارگی کو رسمِ جوانی سمجھ کے ہم
ڈھیروں شراب پی گئے پانی سمجھ کے ہم

پھر گلوکار نے یہ شعر ادا کیا:

کچھ ایسی دل کشی تھی جہانِ خراب میں
جنت بھی چھوڑ آئے پرانی سمجھ کے ہم

سید حامد صاحب نے سر اٹھایا، ان کی جانب دیکھا اور

فرمایا ، افضل میاں ...... جواب مل گیا؟ در اصل وہ خود علی گڑھ کے قتیل تھے۔شاید اسی لیے اس شدتِ جذبات سے انہوں نے اس واقعے کا ذکر کیا تھا۔

بحیثیت رجسٹرار،ان کا علی گڑھ کا قیام خاصا نمایاں اوراہم رہا۔حامدانصاری صاحب وائس چانسلر کے منصب پر فائز تھے۔ ان کی ایماء پر یہ یہاں تشریف لائے۔ان کے دور میں ایک انتہائی ہنگامی صورتِ حال وقوع پذیر ہوئی۔حبیب ہال سے ایک طالب علم کو پولس اٹھا لے گئی۔ پولس سادہ لباس میں تھی۔اس لیے کسی کو شروع میں اندازہ نہ ہوا کہ معاملہ کیا ہے۔بعد میں علم ہوا کہ اسے گرفتار کیا گیا ہے۔آگ لگ گئی۔ہزاروں طلبہ حبیب ہال پر جمع ہو گئے۔ ایک IB کے انسپکٹر کی شامت آئی تھی۔ وہ وہاں چھان بین کرنے پہنچ گیا۔طلبہ نے اس کی حرکات وسکنات کو مشکوک پایا تو ہال کے اندر لے گئے اور یرغمال بنالیا۔حالات بے حد نازک ہو گئے۔ حامد انصاری صاحب نے اس کی محفوظ واپسی کا کام انہیں سونپا۔ہال کے مین گیٹ پر تقریباً پانچ ہزار کا مجمع تھا۔وہاں سے کسی کو باہر نکال پانا ناممکن تھا۔ہال کے اندر داخل ہونا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ایک علی گڑھ کا پرانا طالب علم ہی یہ حوصلہ جٹا سکتا تھا۔ انہوں نے ہال کے پرووسٹ پروفیسر عارف انعام کو ساتھ لیا اور اندر پہنچ گئے۔گفتگو کے فن میں ماہر تھے ہی۔ایسی بات چیت ہوئی کہ جیسے کوئی پرانا طالب علم خیریت پوچھنے آیا ہو۔ اسی دوران ایک دو سینیئر طلبہ کی نشاندہی کی۔ان کو الگ لے گئے۔ان کو صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کیا۔اس انسپکٹر کا کوئی بھی نقصان پہنچنے کی صورت میں ادارے کے لیے کیا خطرات ہو سکتے ہیں اس کی وضاحت کی۔ یہ سنجیدہ حضرات ان کے ہمنوا ہو گئے۔ ہال کے اندر واقع وارڈن ہاؤس سے ایک راستہ باہر جاتا تھا۔اس گیٹ پر ایک اسکوٹر کا انتظام کیا گیا۔حکمت سے اس شخص کو وہاں پہنچایا گیا۔ یہ از خود اسکوٹر پر سوار ہوئے۔اسے بیچ میں بٹھایا۔ایک وارڈن صاحب پیچھے بیٹھے۔تھوڑی دور پر ایک ماروتی کار کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس شخص کو لے کر یہ محفوظ مقام تک پہنچ گئے۔حامد صاحب کو جا کر جب یہ اطلاع دی تو ان پر حیرت اور خوشی کے جذبات غالب آ گئے۔بس ان سے اتنا کہا'' Well done, my boy, well done''۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران ایک اور پیچیدہ معاملے کو حل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔علی گڑھ میں ڈینٹل کالج کا قیام محمود الرحمٰن صاحب کے دورِ اقتدار میں عمل میں آیا تھا۔مگر اس کی باقاعدہ منظوری کا معاملہ نہ حل ہو پایا تھا۔بی.ڈی.ایس کے پہلے بیچ کے طلبہ تشویش کے دور سے گزر رہے تھے۔ان کے کورس کی مدت گزر جانے کے بعد بھی امتحانات نہ ہو پا رہے تھے۔وہ اس وجہ سے احتجاج پر آمادہ رہتے تھے۔انہوں نے اِن طلبہ کو اطمینان دلایا۔طلبہ کا بیان ہے کہ ان سے مل کر ہمیں یہ امید ہو جاتی کہ یہ ہمارا معاملہ حل کرا دیں گے۔یہ بھی ہر ممکن تدبیر میں جُٹ گئے۔خود بھی بھر پور دوڑ بھاگ کی اور ان طلبہ کو بھی انتظامیہ کی مدد کے لئے آمادہ کیا۔اس دوران تقریباً پندرہ روز ہر دن دہلی کا سفر رہا۔طلبہ کو ہریانہ روانہ کیا۔نسیم احمد صاحب (جو بعد میں وائس چانسلر کے منصب پر فائز ہوئے) وہاں Chief Secretary کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے۔انکی مدد سے ہریانہ کے ڈینٹل کالجوں سے منسلک اساتذہ کی تقرری علی گڑھ میں ممکن ہو پائی۔اس سے منظوری کے لیے ضروری اساتذہ کی تعداد پوری ہوگئی۔ بے یقینی کے بادل چھٹ گئے اور معاملہ خیر و خوبی سے حل ہوگیا۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران غیر تدریسی عملے کے معاملات کو حل کرنے میں غیر معمولی دل چسپی دکھائی۔حقیقت ہے کہ یہ طبقہ بے توجہی کا شکار رہتا ہے۔ کتنے معاملات اٹکے رہتے ہیں۔ انہوں نے حل کرائے۔ مزاج وہی تھا کہ اگر یہ احساس ہوگیا کہ اس کو انصاف نہیں ملا تو پھر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے۔علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے کے ان کے ایک استاد رہے تھے۔ان کی اہلیہ کا معاملہ لمبے عرصے سے پھنسا ہوا تھا۔درخواست ان تک پہنچ گئی۔ بے قرار ہو گئے۔ برق رفتاری سے کام عمل میں آیا۔شام تک آرڈر نکل گیا۔ان تک اگلے دن پہنچتا۔یہ برداشت نہ ہوا۔شام کو دفتر سے گھر واپسی میں وہ آرڈر خود ان کے گھر پہنچا آئے۔ پروموشن کے معاملات تو خوب ہی حل کیے۔اپنی یہاں کی تعیناتی ختم ہونے سے پہلے،ایک لسٹ تیار کرا گئے۔جس کی رو سے جگہ خالی ہونے پر خود پروموشن ہو جائے گا۔تقریباً ۱۰۰/افراد کو اس کا فائدہ پہنچا۔ایک دِل جلے نے اس پر لطیفہ بھی گڑھا۔میرے پاس تشریف لائے،کہنے لگے کہ اس بار سول سروس کے امتحان میں ایک سوال آیا ہے کہ ہندوستان کے کس قصبے میں بے روزگاری کی در سب سے کم ہے۔میں نے متعجب ہو کر جواب پوچھا،کہنے لگے،ارے تم نہیں جانتے، مارہرہ میں (ان کا پشتینی قصبہ)۔افضل سب کو نوکر کر گیا۔

دفتر کے عملے میں ایک کراماتی بابا تھے۔ان کے منھ چڑھے تھے۔میں نے اس کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگے کہ جیسا فیصلہ کرنا ہے وہ ویسا rule نکال لاتے ہیں۔مگر ان کو قابو میں کیسے رکھتے ہیں؟ میں نے سوال کیا۔دفتر میں ایک بند الماری کی طرف اشارہ کیا، کہنے لگے کہ اس میں ان کی پرسنل فائل رکھتا ہوں۔کبھی کبھار ان کی موجودگی میں انہیں سے نکلواتا ہوں اور اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں۔ان صاحب کا غیر تدریسی عملے کا الیکشن لڑنے کا ارادہ ہوا۔افضل بھائی کے پاس حاضری دی اور دریافت کیا کہ الیکشن میں کامیابی کے حصول کے لیے کیا عمل کیا جائے۔انہوں نے مشورہ دیا کہ درودِ غوثیہ کا ورد کرو۔اتنا سننا تھا کہ ان صاحب کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ایک رنگ جاتا دوسرا آتا۔انہیں بھی حیرت اور تشویش ہوئی کہ ایسا کیا کہہ دیا۔ پولیس انکوائری کی۔ معلوم ہوا کہ آج کل ان صاحب کا پیچ ایک محترمہ سے لڑا ہوا ہے،جن کا نام غوثیہ ہے۔

علی گڑھ کا قیام اختتام پذیر ہوا تو انہوں نے ایک پیغام علیگ برادری کے نام قلمبند کیا۔اس میں انہوں نے علی گڑھ کی رجسٹراری کو کوفے کی گورنری سے زیادہ مشکل گردانا۔ان کے اس بیان پر خاصی لے دے بھی ہوئی۔دراصل علی گڑھ ان کی وہ معشوقہ تھی جس کو انہوں نے اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کیا تھا۔یہاں کی ہر یاد، یہاں کا ہر واقعہ ان کی ذات کا حصہ تھا۔

عشق اللہ سے ہو یا بتِ کافر سے لگاؤ
آدمی وہ ہے جو رہ جائے کسی کا ہو کر

وہ علی گڑھ سے جا کر بھی،کبھی نہیں گئے۔ ہر اہم اور غیر اہم موقع تلاش کرتے کہ واپس پہنچ جائیں۔

میں بہرحال اسی حلقۂ زنجیر میں ہوں
یوں تو آزاد کئی بار کیا ہے اس نے

اور وقت کی ستم ظریفی، کہ علالت کے آخری تکلیف دہ ایام بھی اسی شہرِ آرزو میں گزارے۔

علی گڑھ سے سبک دوشی کے کچھ ہی وقفے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ چلے گئے۔ وہاں کی رجسٹراری سنبھالی۔اعتراض اٹھایا گیا کہ انہیں جامعات کا چسکا لگ گیا ہے۔مزاجاً وہ خود کو علمی دنیا کے قریب پاتے تھے۔علی گڑھ بھی پروفیسر عبدالرحیم قدوائی صاحب کی دعوت پر کھنچے چلے آتے۔ یو.جی.سی.ایچ.آر.ڈی سینٹر میں اساتذہ سے خطاب ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ڈاکٹر منموہن سنگھ کے سلسلے میں ایک کتاب منظرِ عام پر آئی ہے جس کا عنوان ہے Accidental Prime Minister۔خواہش ہوتی کوئی ان کی بھی سوانح عمری تشکیل کرے جس کا عنوان ہو'' Accidenal Police Officer''۔گاما بھائی (علی گڑھ کے ہر دل عزیز استاد پروفیسر اختر ظہیر رضوی، جنہیں شاید ہی کوئی ان کے اصل نام سے جانتا تھا، جو ان کے خالہ زاد بھائی تھے اور جنہوں نے البرکات ادارے کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا) کہتے تھے کہ کس کس جتن سے اس کو پولس کی نوکری سے استعفیٰ دینے سے باز رکھا جا رہا ہے۔ جامعہ کا قیام بھی خوب Enjoy کیا۔اسی دوران ہمارے شعبہ کا بڑا پروگرام دہلی کے India Habitat Center میں ہونا طے پایا،تقریبا ۲۵۰/افراد پر مشتمل ایک بیڑا تھا، جسے ایک دن پہلے دہلی کے لیے کوچ کرنا تھا۔انہوں نے اس بیڑے کا بیڑا پار لگانے کا ذمہ اپنے سر لیا۔قیام کا پورا انتظام کیا۔لڑکیوں کا انتظام خاص ذمہ داری تھی،اس کے لیے میرے ساتھ وہاں کے گرلس ہاسٹل میں گئے اور اپنی نگرانی میں سارے انتظامات کیے۔

ایک واقعہ وہاں کے قیام کا بیان کیا۔ پروفیسر مشیر الحسن صاحب وہاں بحیثیت وائس چانسلر ذمہ دار تھے۔ سبزے کے خاصے شوقین تھے۔ لان کی دیکھ ریکھ پر خوب توجہ دیتے اور

چاہتے کہ پورا عملہ اس میں مستعد رہے۔ اکثر تمام متعلق افراد کو لے کر صبح معائنے کو نکلتے۔ اسی ایک وزٹ کے دوران ایک لان کے ٹھیک بیچ میں گوبر پڑا پایا۔ لگتا تھا کسی جانور نے ابھی تازہ تازہ فراغت حاصل کی ہے۔ چراغ پا ہوگئے، ڈپٹ کر پوچھا، یہ کیا ہے؟ عملے کو سانپ سونگھ گیا، مگر یہ گویا ہوئے، کہنے لگے کہ کھاد ہے سر۔ ایک قہقہ پڑا اور ماحول گُل گلزار ہوگیا۔ یہ حاضر جوابی آپ کا خاصہ تھی۔

وہاں کی تعیناتی کے دوران ممبئی کا سفر ہوا۔ واپسی میں کمر میں چک آ گئی۔ یہ خبر عام ہوئی تو کچھ فکرمند اور بیشتر اہلِ غرض ملاقاتیوں کا ٹھٹ لگ گیا۔ ایک دو دن تو یہ برداشت کیا۔ پھر ایک مضمون تحریر کیا۔ ''ایک کام کے سلسلے میں ممبئی کا سفر ہوا تھا۔ واپسی میں جہاز کی سیٹ میرے حجم اور جسامت کے حساب سے نہ تھی۔ اسی میں آنکھ لگ گئی۔ اس کے چلتے کمر میں تکلیف ہوگئی۔ فلاں ڈاکٹر نے دوا تجویز کردی ہے۔ ایک ہفتے میں انشاءاللہ مکمل افاقہ ہو جائے گا''۔ یہ تحریر دفتر میں چسپاں کروا دی۔ کوئی اس سلسلے میں تشریف لاتا تو اسے پڑھنے کی تاکید کر دیتے۔

دہلی کے قیام کے دوران UGC میں اپنی پکڑ بنالی تھی۔ جس سے جامعہ کی کارگزاری اور گرانٹ حاصل کرنے میں سہولت ہوگئی۔ بحیثیت یو.جی.سی آبزرور اس مدت میں علی گڑھ منعقد ہونے والی سلیکشن کمیٹیوں میں کئی بار تشریف لائے۔ ایک بار کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہماری ایک عرضِ داشت کا یو.جی.سی. سے نفی میں جواب آیا۔ میں فائل لے کر پہنچ گیا۔ ایک جوائنٹ سکریٹری ان سے مانوس ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے عرضِ داشت دوبارہ رکھی۔ حوالہ دیا کہ فلاں فلاں جامعات میں یہ ہو رہا ہے۔ اس پر ان صاحب نے ان کو ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ بہت بڑا قلعہ تھا۔ ایک دربان اس کی نگہداشت پر مامور تھا، مگر غور در غول افراد اس میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک صاحب جو ضابطے کے خاصے پابند تھے انہوں نے دربان سے اندر جانے کی اجازت چاہی۔ اس نے مستعدی سے انکار کر دیا۔ انہیں حیرت ہوئی۔ سوال کیا کہ یہ دیگر حضرات تو جا رہے ہیں۔ دربان بولا کہ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھوڑی ہے۔ یہ فائل بغل میں دبا کر واپس آ گئے۔

جامعہ کا تقرر اچانک اختتام پذیر ہوا۔ ملاقات ہوئی تو میں نے وجہ دریافت کی۔ کہنے لگے کہ ہم تھوڑا منھ پھٹ ہیں، زیادہ بول جاتے ہیں۔ ایک مشہور سیاسی رہنما کا نام لیا۔ کہا کہ ان کے نام پر ایک سینٹر قایم کرنے کا مشورہ تھا۔ ہم نے کہہ دیا کہ ان کے گزر جانے کا تو انتظار کر لیا جائے۔ میں نے خدمت میں شعر پیش کیا۔

اتنا سچ بولنا کہ دنیا میں
چند لوگوں کو ہم زباں رکھنا

کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر سر کی جنبش سے میری بات کی تائید کی اور ارشاد فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔

کوئی دو دہائی پہلے میرا رشتہ ان کی پہل پر ان کی ہمشیرۂ نسبتی سے طے ہوگیا۔ ان کی یہ سند کافی تھی کہ میں پرویز کو ہاسٹل کے زمانے سے جانتا ہوں۔ شادی سے قبل مجھ پر ایک سال آزمائش کا گزرا تھا۔ شادی کے وقت یہ بحیثیت ایس. پی چھتر پور تعینات تھے۔ میں نے ان کو خط لکھا اور ایک شعر درج کیا۔

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے
کاروانِ بہار دیکھا ہے

پسند فرمایا، چھتر پور آنے کی دعوت دی۔ ہم دونوں پہنچ گئے اور تقریباً ۱۵؍روز کا قیام رہا۔ متعدد مقامات کی سیر کرائی۔ کھجراہو قریب ہی واقع تھا۔ وہاں بھی لے گئے۔ اور چٹکی لی کہ اب تم اس کا دیدار کر سکتے ہو۔ کیا کیا ضیافتوں کا نظم رہتا، جس کا بیشتر سہرا راشدہ بھابھی کی مہمان نوازی کو جاتا ہے۔ اپنے طول و عرض میں پھیلے سرکاری بنگلے میں ایک بڑے دربے کا انتظام رکھتے۔ اس میں مختلف اقسام کے دیسی مرغ اور دیگر چرند پرند قیام کرتے اور بانگ دہل اعلان کرتے رہتے کہ آقا آپ کے ایک اشارے پر ہم قربان جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ کڑکناتھ اور اصیل نسل کے دیسی مرغوں سے آپ ہی نے تعارف کروایا۔

اس دوران ان کے ساتھ کئی سرکاری اور سماجی جلسوں میں شرکت رہی۔ ان کی وہاں شہرت اور مقبولیت کا اندازہ ہوا۔ اللہ نے زبان کا ایسا ہنر بخشا تھا کہ ہر قسم کی مجلس میں چھا جاتے تھے۔ تقریر میں اپنے وسیع مطالعے کا کیا خوب استعمال کرتے۔ برادرانِ وطن کی اصطلاحات سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ ایک جلسے میں ''پرسورام کا پرسہ'' اس سلیقے سے پھینکا کہ سامعین عش عش کرنے لگے۔ ابھی بیماری کے دوران ان کی ایک شناسا لتا بھابھی، جن سے گوالیار میں تعیناتی کے دوران بالکل گھریلو قسم کا تعلق ہو گیا تھا، کا فون میری اہلیہ کے پاس آیا۔ رمضان کا مہینہ تھا، دریافت کیا کہ روزہ کیسے رکھا جاتا ہے؟ مجھے افضل بھائی کی صحت یابی کے لیے رکھنا ہے۔ میری اہلیہ گھبرا گئیں۔ ان کی خراب صحت کا واسطہ دیا۔ ان کی بڑھی ہوئی شوگر کا حوالہ پیش کیا۔ یہ بھی کہا کہ ایسی صورت میں ہمارے مذہب میں روزہ نہ رکھنے کی تاکید ہے۔ انہیں ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ جب انہیں احساس ہوا کہ وہ اس عمل پر بضد ہیں تو راشدہ بھابھی سے درخواست کی کہ آپ سمجھائیں۔ دو دن بعد ان کا فون آیا کہ ہم نے روزہ رکھ لیا ہے۔ ہم بالکل ٹھیک ہیں اور ہمارے بھائی بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی مقبولیت ہر طبقہ میں، بغیر مذہب و مسلک کی تفریق کے، یکساں تھی۔

چھتر پور سے علی گڑھ کا سفر طویل تھا۔ واپسی کا پورا انتظام کیا۔ کہاں کہاں سفر میں قیام کرنا ہے اس کی پوری تفصیل طے کی۔ حسنِ اتفاق کہ واپسی میں وہ مقامات پڑتے تھے جہاں ان کی تعیناتی رہی تھی۔ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ ان سب کے باوجود علی گڑھ پہنچتے پہنچتے تھکن ہوگئی۔ اہلیہ کی طبیعت بگڑ گئی۔ ایک نسوانی تکلیف اجاگر ہوئی۔ علی گڑھ میں علاج ہوا۔ افاقہ نہ ہوا تو آگرہ میں آپریشن طے ہوا۔ موصوف کو اطلاع ہوئی، دوڑے چلے آئے، میرے ساتھ آپریشن تھیٹر کے باہر ٹہلتے رہے۔ ہر رات کے بعد دن کی آمد ہوتی ہے۔ اللہ نے جڑواں بچوں سے نوازا، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ مجھے مبارکباد دی اور کہا اللہ نے سن لی، ۲۰۰؍فیصد رزلٹ آیا ہے۔ کوئی تین دہائی پہلے میری ہمشیرہ شمیم بھائی سے منسوب ہوئیں۔ شمیم بھائی بھی بھائی صاحب کے حلقۂ احباب کا اہم رکن تھے۔ یہ مقابلہ جاتی امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کر صوبے میں ایس.ڈی.ایم کے عہدے پر فائز تھے۔ موصوف کی پولس کی چاکری کی شروعات ہو چکی تھی۔ شادی کے بعد شمیم بھائی سے دھمکی آمیز انداز میں کہنے لگے کہ اس بات کا خیال رکھنا کہ ایک پولس والے کی بہن لے کر جا رہے ہو۔ شمیم بھائی بھی علی گڑھ کے تربیت یافتہ تھے، جواب دیا کہ فکر نہ کریں، چپراسیوں کی سی زندگی گزاروں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ کیا کیا صحبتیں رہیں اور کیسی کیسی محبتیں میسر آئیں، اگر ان سب کا ذکر کروں تو صفحات کم پڑ جائیں۔

پھر وہ آزمائش کا وقت آیا۔ طبیعت کی خرابی کی شروعات ہوئی، دہلی سے بھوپال جانے کی تیاری تھی۔ چکر آئے۔ AIIMS لے جایا گیا۔ وہاں بظاہر اطمینان دلایا گیا۔ لیکن ڈاکٹر کو شبہہ بھی تھا، Second Opinion کا مشورہ دیا۔ یہ نظر انداز کر گئے اور بھوپال چلے آئے۔ بھوپال میں وہ کیفیت پھر طاری ہوئی۔ یہ تقریباً ۱۵؍دن کا وقفہ بیماری کے زور پکڑنے کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ ممبئی کے ہندوجا ہسپتال میں آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر نے اپنے لحاظ سے ۹۰؍فیصد ٹیومر جسم سے باہر نکال دیا۔ اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ دماغ کی نسوں کا معاملہ تھا۔ جو کچھ بچا تھا اس کے لیے ریڈی ایشن اور کیموتھیراپی کا تکلیف دہ سلسلہ شروع ہوا۔ تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں۔ خیریت دریافت کرنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہا تھا۔ ۱۳؍اکتوبر کو اپنے میسیج سے خود ہی اپنی صحت کی خرابی کی اطلاع دی۔ فرمایا کہ ۲۰؍اگست کو برین اسٹروک ہوگیا تھا۔ لیکن خدا کے فضل سے کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ ہائی لیول کے بلڈ تھنرس کھلا رہے ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گے، انشاء اللہ۔ بیشتر حضرات میں ایک طبیب قیام کرتا ہے جو ایسے مواقع پر مفید مشورے دینے کے لیے بےچین رہتا ہے۔ میں نے بھی فوراً مشورہ داغا۔ عرض کیا کہ ارجن کی چھال کارآمد بلڈ تھنر ہے۔ ماموں لیتے تھے ان کے سارے بلڈ تھنرز چھوٹ گئے۔ جواب آیا کہ ماموں نہ چھوٹ جائیں، اس کی فکر کرو۔ یہ تھی ان کی حسِ مزاح۔ ایسے مصائب سے گزرنے پر بھی کبھی بیماری کو اپنے اوپر طاری نہیں کیا۔ بلکہ دوسروں کی دلجوئی کی فکر کرتے رہے۔ میں اور میرے شفیق استاد پروفیسر جاوید اختر صاحب نے عیادت کے لیے ممبئی کے سفر کا ارادہ کیا۔ جاوید صاحب نے ٹکٹ وغیرہ کا

انتظام کیا۔ میرا، ان کا اور میری اہلیہ کا ۹ نومبر کا سفر طے ہوا۔ سفر سے ایک دن پہلے معلوم ہوا کہ بابری مسجد کا فیصلہ آنا ہے۔ احتیاط کے مدِ نظر خود ہی فون کروا دیا کہ پرویز سے کہو کہ سفر نہ کرے۔

ممبئی میں آپریشن کے کچھ دن بعد ان کے اصرار کے سبب فون مہیا کرا دیا گیا۔ فون سے خاص رغبت فرماتے تھے۔ آخر اپنے احباب سے تعلق کا یہ اہم ذریعہ جو ٹھہرا۔ امین بھائی ان کے ہاسٹل کے قیام کے دوران اکثر تبصرہ کرتے کہ افضل کو ایک فون اور ایک اسکوٹر دستیاب کر دو، پھر اسے کسی اور چیز کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہاسٹل کے بہت کم مکینوں کو اسکوٹر میسّر تھا۔ اپنے وقت کا ایک خطیر حصہ اس سے علی گڑھ کی خاک چھاننے میں لگاتے۔ کس کس کے کام نہ اپنے ذمہ لیتے۔ کتنے ہی ساتھیوں کی ڈگریاں انہیں کی سفارشوں کی مرہون منت ہیں۔ میرا ایم.بی.اے کے تحریری امتحان میں سلیکشن ہوا۔ میرے بار ہا منع کرنے پر بھی جنرل ایجوکیشن سنٹر (جہاں یہ لٹریری کلب کے سکریٹری تھے) کے کوآرڈینیٹر پروفیسر حبیب الرحمٰن سے ملوانے لے گئے۔ وہ اس وقت مشترکہ مینجمنٹ اور کامرس فیکلٹی کے ڈین بھی تھے۔ میرے لیے خاص نظرِ کرم کی درخواست کی۔ وہ بھی صاحب کمال بزرگ اور شفیق استاد تھے، مفید مشوروں سے نوازا۔ انٹرویو کے دوران خوب حوصلہ افزائی کی۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ فون واپس مل جانے پر اپنے احباب سے خود رابطہ کیا اور اپنی خیریت سے گوش گزار کیا۔ اسی دوران ایک دن میرے پاس فون آیا۔ اپنی طبیعت کا حال بیان کیا اور پھر مجھ سے ہسٹری کے لائق استاد ڈاکٹر سجاد کا نمبر طلب کیا۔ ان کی ایک کتاب تبھی منظر عام پر آئی تھی۔ شاید اس کی مبارک باد دینا مقصود تھا۔ میں اس دن کچھ الجھا ہوا تھا، بیٹے کی طبیعت ناساز چل رہی تھی۔ ڈاکٹر عاصم رضوی صاحب سے وقت لیا تھا۔ اس جلدی میں ڈپارٹمنٹ سے نکلا اور ان کے مطب پہنچا۔ بیٹے کو گھر پہنچا کر ڈپارٹمنٹ واپس ہوا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دیکھا انہیں کا فون ہے۔ یاد آیا کہ یہ کام سونپا تھا۔ فون پر خفگی کا اظہار کیا، کہنے لگے پرویز اب ہم اتنے غیر اہم ہو گئے۔ تم ہمارا اتنا سا کام نہ کر سکے۔ وہ جن حالات سے گزر رہے تھے، اس میں اس جملے کی کاٹ تیز تھی۔ تیر کی مانند دل پر لگی۔ اپنی کمزور صفائی پیش کی۔ کچھ مطمئن نہ نظر آئے۔ پھر فون کاٹ دیا۔ میری طبیعت بوجھل ہو گئی۔ عجب شرمندگی اور ندامت طاری تھی۔ کسی کام میں دل نہ لگ رہا تھا۔ آخر کار ہمت جٹائی، فون لگایا اور بغیر کسی تمہید کے دریافت کیا، افضل بھائی! ناراض تو نہیں ہیں؟ شیر و شکر ہو گئے۔ کہنے لگے، ارے بھول جاؤ! تم میری جان ہو، اپنی جان سے بھی کوئی ناراض ہوتا ہے۔

مزید علاج کے لیے چینئی لے جایا گیا۔ اپولو اسپتال کے پروٹون سینٹر میں ڈاکٹر راکیش جلالی کی سرپرستی میں ریڈی ایشن اور کیموتھراپی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر جلالی ان سے بے حد مانوس ہو گئے تھے۔ پہلی ملاقات میں ہی میں ان سے پوری قوم کی جانب سے معافی طلب کی۔ ڈاکٹر جلالی کشمیری پنڈت ہیں اور ان کا خاندان وہاں کی شورش کے سبب وادی کو خیرباد کہہ چکا ہے۔ ڈاکٹر جلالی کہتے تھے کہ اگر اس حوصلے کا مریض ہو تو علاج میں سہولت ہو جاتی ہے۔ جب عیادت کے لیے چینئی میں میری حاضری ہوئی تو اگلا دن ریڈی ایشن کا دن تھا۔ ریڈی ایشن کے بعد حالت غیر ہو جاتی تھی۔ کچھ کھانے کی طرف طبیعت مائل نہ ہوتی تھی۔ مگر میرے لیے نہاری کا انتظام کیے بیٹھے تھے۔ ان کے ایک معترف بھوپال سے تشریف لا رہے تھے۔ ان سے پہلے ہی اصرار کر چکے تھے کہ گھر سے نہاری بنوا کر لائیں۔ پرویز آ رہا ہے۔

چینئی سے علاج کے بعد علی گڑھ تشریف لے آئے۔ پھر لاک ڈاؤن شروع ہو گیا۔ چینئی جانا ممکن نہ تھا۔ ڈاکٹر جلالی کی سرپرستی میں یہیں علاج جاری رہا۔ یہ سب کے لیے آزمائش کا وقت تھا۔ آہستہ آہستہ قویٰ جواب دے رہے تھے۔ ایسے حالات میں ایک دن ہمارے گھر تشریف لائے۔ چلنے میں تال میل کی کمی واقع ہونے لگی تھی۔ ہمارے گھر کی پہلی منزل پر میرا قیام ہے۔ امی اور بھائی صاحب کی رہائش نچلے حصے میں ہے۔ خلاف معمول، پہلے ہی اوپر آ گئے۔ خاصی دیر قیام کیا۔ میں ان کی پسند کی غزلیں اور قوالیاں سنواتا رہا۔ میری اہلیہ عذرا سے چھوٹی بہن کا دلار رکھتے تھے۔ اس کے ہاتھ کا کھانا پسند فرماتے تھے۔ اس دن بھی اس کی ضیافت سے خوب محظوظ ہوئے۔ پھر واپسی کے ارادے سے نیچے اترے۔ امی نے کھڑکی سے جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ باہر آ کر ان سے لپٹ گئیں۔ امی کی آنکھیں اشک بار دیکھیں تو اندر واپس آ گئے۔ کہنے لگے کہ میں اسی لیے نیچے نہیں آ رہا تھا۔ پھر بہت دیر امّی سے پرانی باتوں کا ذکر کرتے رہے۔ اپنی دلچسپ گفتگو سے ان کا دل بہلاتے رہے۔ اور پھر تبھی واپس ہوئے جب امّی کے ہوش و حواس قابو میں آ گئے۔

اور پھر وہ وقت آیا جو ہر ایک کی قسمت اور منزل ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ مرض آہستہ آہستہ پاؤں پسار رہا تھا۔ جسم ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ اپنی روز مرّہ کی ضروریات بھی دوسروں کے سہارے پر منحصر تھی۔ مگر ایک معنی میں ان کی قسمت پر رشک بھی آتا تھا۔ تیمارداروں کا ایک غول تھا جو صبح و شام کی قید و بند سے آزاد ہو کر خدمت میں لگا تھا۔ راشدہ بھابھی کی آنکھوں سے تو جیسے نیند رخصت ہو چکی تھی۔ اگر انہیں بہت اصرار کے بعد تھوڑے بہت آرام کے لیے بھیج بھی دیا جاتا تو ان کا دل وہیں اٹکا رہتا۔ بار بار واپس ہوتیں اور اسی فکر میں لگی رہتی کہ انہیں کوئی ضرورت تو نہیں۔ وقت کی ستم ظریفی کہ اسی دوران امین بھائی اور ان کو کووڈ نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ دہلی کے میکس ہسپتال لے جانا پڑا۔ اس سے کمزوری اور بڑھ گئی۔ امین بھائی پر تو کووڈ کا حملہ اور سخت تھا۔ زینہ چڑھنا اور اترنا دشوار ہو گیا تھا۔ مگر نیچے آ جاتے۔ خاموش اور نمناک آنکھوں سے انہیں جاتا ہوا دیکھتے رہتے۔ راشدہ بھابھی کی بڑی بہن، عالیہ آپا اگست ۲۰۱۹ء میں ایک ہفتے کے ارادے سے الٰہ آباد سے تشریف لائیں تھی۔ ایک سال سے زیادہ گزر چکا تھا اور انہیں واپسی نصیب نہ تھی۔ وہ راشدہ بھابھی کا سایہ بنی ہوئی تھیں۔ اشرف بھائی کا رٹائرمنٹ لگتا تھا اسی لیے ہوا ہے کہ وہ خود کو ان کی صحت یابی کے حصول کے لیے وقف کر دیں۔ چینئی میں تمام طبی سہولیات دستیاب تھیں۔ مگر کس شفقت سے ان کے سر کے آپریشن کے زخم کی مرہم پٹی کرتے۔ میرا افضل بھائی کے چھوٹے بھائی، بھائی نجیب حیدر سے کوئی ایسا واسطہ نہیں رہا تھا۔ ان کا زیادہ تر وقت مارہرہ کے پشتینی ورثے کے معاملات دیکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ مگر آخر کے ۲۳ / دنوں میں جب افضل بھائی علی گڑھ کے وِرون اسپتال کے آئی.سی.یو میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے ان سے ہر روز ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ ان کے تیمارداری کے جذبے کو ہر وقت سلام کرنے کو دل چاہتا۔ آج کے اس نفسا نفسی کے دور میں، ان بھائیوں کی کیمسٹری نرالی اور مثالی ہے۔ لگتا ہے ابرو کی جنبش سے ایک دوسرے کے دل کا حال سمجھ لیتے ہیں۔ اللہ اسے قائم و دائم رکھے۔ آمین ثمہ آمین

قریبی عزیز و اقارب کی بات تو سمجھ آتی تھی۔ مگر کچھ دوست بھی اس تیمارداروں کے حلقے میں شامل رہے۔ ڈاکٹر فہیم عثمان صدیقی، جو البرکات ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز کے کوآرڈینیٹر ہیں اور ان کے طالب علمی کے زمانے کے ہم نوا ہیں، دامے درمے ساتھ رہے۔ اسی زمانے کے ساتھی، ذاکر بھائی بھی مستقل سایہ بنے رہے۔ لگتا تھا کہ ان حضرات کا ان کی صحت یابی کی کوشش کے علاوہ کوئی اور مقصدِ حیات ہی نہیں رہا ہے۔ داخلی اور اندرونی معاملات کے تال میل میں یہ حضرات اشرف بھائی کا دایاں اور بایاں ہاتھ بنے رہے۔ نوید مسعود صاحب عیادت کے لیے ممبئی تشریف لے گئے۔ تیمارداری کا یہ رنگ دیکھا تو فرمایا کہ اگر مجھے یہ نصیب ہو تو ہر وقت بیمار ہونے کے لیے آمادہ رہوں۔

کووڈ سے ابھرنے کے بعد علی گڑھ پہنچے ہی تھے کہ اپنے فرزند، برکات کے نکاح کا فیصلہ کیا۔ انہیں علم ہوا کہ اقراء، جس سے برکات کی منگنی کر چکے تھے، اپنا ہاسٹل کا کمرہ خالی کرنے دہلی آئی ہوئی ہے۔ اسے علی گڑھ بلا لیا۔ اس کے والدین سے بھی درخواست کی کہ وہ علی گڑھ آ جائیں۔ ہم سب متعجب تھے کہ ایسی کیا عجلت ہے۔ علی گڑھ میں کووڈ کا زور تھا۔ ہمارے خاندان پر بھی اس کا اثر واقع ہوا تھا۔ امی کی جانب سے فکر لاحق رہتی۔ ایسے میں شادی میں شرکت دشوار کُن عمل تھا۔ بادل نخواستہ طے کیا کہ شرکت ممکن نہیں۔ میں نے عذر پیش کیا اور شرکت نہ کر پانے کی معذرت کی۔ جواب آیا

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

آج افسوس ہوتا ہے کہ ہم کیوں نہ ان کی کیفیت کا اندازہ

کرسکے۔ دراصل ہم میں سے بیشتر حضرات دنیا کو اور گزرنے والے واقعات کو اپنے چشمے اور نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میرے والد ان کے سلسلے میں اکثر رائے پیش کرتے تھے کہ افضل کے مزاج میں ایک 'بے قراری' ہے۔ ان حالات میں ان کے اس فیصلے کو ہم نے اُسی مزاج سے تعبیر کیا۔ ان کے اندرون خانہ کیا چل رہا تھا، آج سمجھ میں آتا ہے۔ انہیں خوب احساس تھا کہ ان کے پاس وقت محدود ہے۔ اس کی تصدیق ان کی بیچ میٹ کے بیان سے بھی ہوتی، جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔

برکات کی شادی کے بعد صحت میں گراوٹ نمایاں تھی۔ اپنے کمرے تک محدود ہو گئے تھے۔ کھانے سے رغبت ختم ہو گئی تھی۔ کوئی بھی ثقیل چیز طبیعت پر بار ہو جاتی۔ میں ان کے لیے پانی والا ناریل لے جاتا۔ اسے شوق سے پی لیتے۔ اسی دوران ایک دن ان کے کمرے میں اقرا بی بی موجود تھیں۔ جیسا میں ذکر کر چکا ہوں کہ میری شادی میں شرکت نہ ہو پائی تھی۔ اس کا مجھ سے تعارف کروایا۔ کہنے لگے کہ یہ nutrition کی فیلڈ میں اچھی تعلیمی لیاقت رکھتی ہیں۔ NET کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کر چکی ہیں۔ اب اسی فیلڈ میں بحثیت استاد طبع آزمائی کی خواہش مند ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ کے فضل سے مشق کے لیے ایک طالب علم بھی دستیاب ہو گیا ہے۔ محظوظ ہوئے۔ اقرا سے کہنے لگے، دیکھو یہ ہے ہمارے یہاں کا سینس آف ہیومر۔

بیماری حاوی ہو چکی تھی۔ ممبئی کے ڈاکٹر کا ایک قول وجہِ امید تھا۔ انہوں نے کہا تھا 'Miracles do happen'۔ کیا کیا دعاؤں، وظیفوں اور صدقوں کا اہتمام تھا۔ لیکن قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ ایک آخری کوشش کی گئی۔ ایک خاص انجیکشن کا نظم کیا گیا۔ ۲؍ گھنٹے کی مشقت کے بعد جب وہ جسم میں داخل ہو گیا تو ڈاکٹر سنجیو بھار گو مطمئن نظر آئے۔ کچھ بہتری بھی محسوس ہوئی۔ مگر وہ چراغ کے بجھنے سے پہلے کی جھلملاہٹ ثابت ہوئی۔ ۱۵؍ دسمبر کا دن سخت تھا۔ فہیم بھائی اور امان میاں (ان کے بڑے بھتیجے) لواحقین کو فون کر کے ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔ مگر دل تسلیم نہ کرتا تھا۔ ابھی کچھ ہی وقت تو گزرا تھا کہ میں نے شجاع خاور کی غزل ان کی خدمت میں پیش کی تھی۔

میرے حال پر مہربانی کرے
خدا سے کہو حکمِ ثانی کرے
میں اک بوند پانی بڑی چیز ہوں
سمندر مری پاسبانی کرے

اور یہ شعر خاص ان کی نذر کیا تھا۔

مرے سائے میں سب ہیں میرے سوا
کوئی تو مری سائے بانی کرے

آخر کار، یہ ہوا کہ رات کے تقریباً ۹ بجے تارِ نفس ٹوٹ گیا اور یہ سایہ دار شجر اپنے ہم نواؤں کو روتا بلکتا چھوڑ کر آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔ حقیقت سامنے تھی۔ پر اعتبار نہ ہوتا تھا۔ بٹی کائنات کی تو جیسے کائنات ہی اجڑ گئی تھی۔ برکات کی ولادت کے ۹ سال بعد اللہ نے یہ تحفہ بخشا تھا۔ اس کا خاص لاڈ کرتے تھے۔ بالکل دوستوں والا معاملہ تھا۔ بچیاں جن نشو و نما کے مراحل میں عام طور سے اپنی والدہ سے رجوع کرتی ہیں وہ بھی یہ انہیں سے ڈسکس کرتی۔ انتقال کے بعد یہ صدمے کی کیفیت سے دو چار تھی۔ آنسو خشک ہو گئے تھے۔ بار بار یہی کہتی کہ مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا ہے۔ طفلی کے زمانے میں مشتاق یوسفی کا ایک مقولہ پڑھا تھا۔ وہ رقم طراز تھے کہ جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کوئی نعم البدل نہیں ہے، ان کے گزرنے سے خلا صرف دو گز زمین میں پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی ان کے جسدِ خاکی سے پُر ہو جاتا ہے۔ یاد آتا ہے کہ تب ہم نے اس قول کو سچ جانا تھا۔ اس دن احساس ہوا کہ یہ حق نہیں ہے۔ اپنے جذبات کو جون ایلیا کے شعر کے زیادہ قریب پایا۔

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے تسلی دوں۔ بہت کوشش کے بعد اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر صرف یہ کہہ سکا کہ بٹیا تمہارے ابا کا تو کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ مگر سب کوشش کریں گے کہ تمہیں ان کی کمی کا احساس کم ہو۔

یہ خدمت خلق کے جذبے کا کمال تھا کہ انتقال کے بعد چہرے پر اس تکلیف کا شائبہ تک نہ تھا جو آخری ایام میں گزری تھی۔ لگتا تھا پر سکون نیند میں ہیں اور ابھی اٹھ کر فضاؤں میں خوشبوئیں بکھیر دیں گے۔ گھر لایا گیا اور جسدِ خاکی کو دیدار کے لیے رکھا گیا۔ کائنات ان کے سرہانے بیٹھ گئی اور ان کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ ایمن (بڑی بھتیجی) کا بیان ہے کہ کائنات کے اس عمل سے مجھے ان کے چہرے پر سکون میں مزید اضافہ محسوس ہوا۔ یہ سکون اور گہرا ہو گیا جب مارہرہ والے گھر پہنچے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ پشتینی دیار مارہرہ میں ہزاروں (کوئی ۲۵؍ ہزار کا ہجوم ہوگا) کا مجمع آخری سفر میں شامل تھا۔ وہاں کی سسکیاں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ زندگی اس کو کہتے ہیں۔ پولس محکمے نے آخری سلامی کا خاص اہتمام کیا۔ امین بھائی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حالاں کہ ان کے آنسو کسی طرح نہ تھم رہے تھے۔ کاندھا دینے والوں میں ایک ہوڑ لگی تھی۔ جیسے تیسے مارہرہ کی پشتینی درگاہ میں پہنچایا گیا۔ اور پھر یہ وہاں اپنے اجداد اور دیگر بزرگوں کے قدموں تلے اور اپنی والدہ کے قریب ابدی نیند سو گئے۔ بیٹے برکات سے وصیت کی تھی کہ ہماری تربت کچی رکھی جائے۔ ایسا ہی کیا گیا۔

ان کو سپرد خاک کر، میں مارہرہ سے علی گڑھ واپس آ گیا۔ غم واندوہ سے دل لبریز تھا۔ یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ بچوں کو مارہرہ چھوڑ آیا تھا۔ گھر کی تنہائی اس یادوں کے سلسلے کو مزید دراز کر رہی تھی۔

دشوار کام تھا تیرے غم کو سمیٹنا
میں خود کو باندھنے میں کئی بار کھل گیا

اس مضمون کے ذریعے ان یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا۔ کتنی یادیں تھیں جو قلم بند ہونے کی خواہش مند تھیں۔ جیسے تیسے یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچا، مگر اس کے عوض دل ہلکا ہو گیا۔

مارہرہ میں تعزیت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بچوں کا بیان ہے کہ آنے والوں کا تانتا لگا تھا۔ ان میں خاص ان کے عملے کے وہ افراد تھے جن سے ملازمت کے دوران واسطہ رہا۔ ان میں ایک ملازم شیلندر بھی تھا۔ اس کا گوالیار کی تعیناتی کے دوران سابقہ رہا۔ ان کا قرب نصیب رہے اس نیت سے وہ اپنا تبادلہ کرا کر بھوپال آ گیا تھا۔ ان کے بھوپال والے سرکاری گھر ہی میں اس کا قیام تھا اور ان کے ڈرائیور کے فرائض انجام دیتا تھا۔ میرے بیٹے کا بیان ہے کہ شیلندر بھیا کہہ رہے تھے کہ میرا باپ چلا گیا۔ یہی جذبات ان کے ایک اور ڈرائیور ساتھی اقبال بھائی کے تھے۔ اے. ایم. یو کے ان کی جگری دوست اور پھر پولس کی ملازمت کے ہم قدم منوج یادوٗ صاحب جو ماشاء اللہ اس وقت ہریانہ کے DGP ہیں اپنی اہلیہ کے ساتھ مارہرہ تشریف لائے۔ امین بھائی کی اجازت حاصل کر درگاہ میں مقیم ان کی آخری قیام گاہ گئے اور سرہانے بیٹھ گئے۔ دو گھنٹے اپنا خاموش خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ میرا بیٹا وہاج تھوڑا ابزنس کا رجحان رکھتا ہے اور خوب پیسہ کمانے کی خواہش رکھتا ہے۔ اسی لیے ہائی اسکول کے بعد کامرس کی اسٹریم اپنے لیے منتخب کی ہے۔ واپس آیا تو کہنے لگا کہ پاپا پیسہ تو سب کما لیتے ہیں۔ افضل خالو نے عزت اور محبت کمائی۔ محمود رامپوری کا شعر:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں جانے کے لیے

ایسے شخص کا جانا یقیناً دل پذیر سانحہ ہے۔ مگر اس کا گزرنا صرف غم کے اظہار کا موقع نہیں، یہ ایک لمحۂ فکریہ بھی ہے۔ ان کی زندگی کا محاسبہ ضروری ہے۔ اللہ کا شکر بھی بجا لانا واجب ہے کہ ہمیں ایسی شخصیت کا قرب نصیب رہا۔ اس کا جشن بھی لازم ہے۔ حتی الامکان ان کے اوصاف کو زندگی میں اتارنے کی کوشش ان کے لیے عین خراج عقیدت ہوگا۔

مضمون کا اختتام پروین شاکر کے اس شعر سے کرنا چاہوں گا۔

گردِ رہ بن کر کوئی حاصل سفر کا ہو گیا
خاک میں مل کر کوئی لعل و گہر ہونے کو ہے

***

مسٹر یعقوب یونس

از ڈاکٹر اختر حسین آفتاب (نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ)

آپ نے مسٹر یونس بیرسٹر کا نام ضرور سنا ہوگا۔ وہ بہت بڑے قانون داں، ماہر صنعتکار اور سیاست داں تھے۔ پٹنہ کا Grand Hotel انہوں نے ہی تعمیر کرایا تھا، جس میں انگلینڈ، فرانس اور جرمنی سے لوگ Booking کروایا کرتے تھے۔ اس ہوٹل میں یونس صاحب نے جب بھی رکھا تو انگریز منیجر رکھا۔ انہوں نے Union Bank قائم کیا اور فتوحہ اسلام پور لائٹ ریلوے کے چیف بنے۔ وہ غیر منقسم بہار (1937) کے 1937 میں Prime Minister ہوئے، اور پہلی بار اردو کو بہار میں دوسری سرکری زبان کا درجہ دیا۔

مسٹر یعقوب یونس انہیں مسٹر یونس بیرسٹر کے بیٹے ہیں۔ مسٹر یعقوب یونس کی پیدائش پٹنہ میں 20 اگست 1921 کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد یعقوب صاحب نے 1937 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ہائر ایجوکیشن کے لئے علی گڑھ گئے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے BA اور LLB کی ڈگری حاصل کی۔

کالج میں یعقوب صاحب اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے، انہیں باڈی بلڈنگ، گھوڑے سواری اور شکار سے دلچسپی تھی۔ وہ اسکیٹنگ کے بھی شائق تھے۔

یعقوب صاحب دیکھنے میں بہت خوبصورت تھے۔ قد لگ بھگ 6 فٹ تھا، بال گھنگرالے تھے اور ہلکی زردی مائل تھے۔ سائیکل سواری کا بھی شوق تھا۔ جیسا کہ یعقوب صاحب کے ایک دوست نے مجھ سے کہا جو کہ علی گڑھ ہی میں پڑھ رہے تھے۔ ''یعقوب صاحب جس وقت بن سنور کر اپنی Corden Raleigh سائیکل پر نکلتے تو لڑکیاں ہوسٹل سے اپنی نگاہیں چوری سے ان پر ڈالتیں۔ مَلِک لوگ تو دیکھنے میں یوں بھی خوب رو ہوتے ہیں، لیکن یعقوب صاحب پر قدرت کی خاص عنایت تھی۔

کالج کا دور تو ختم ہوا، اب یعقوب صاحب پر فلم کا بھوت سوار ہوا۔

ان دنوں فلم کا مرکز بمبئی نہ تھا، بلکہ کلکتہ تھا۔ اس لئے یعقوب صاحب کلکتہ چلے گئے اور فلمی ہستیوں سے اپنا رابطہ قائم کیا۔ ایک دو فلموں میں کام بھی کیا، لیکن وہ فلمیں Flop رہیں۔

آخری فلم جس میں انہوں نے کام کیا اس کا نام ''بغاوت'' تھا، یہ فلم پوری تو ہوئی لیکن اس درمیان میں 1946 میں فرقہ وارانہ فساد کی وجہ کر پردے پر نہ آسکی۔

مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح، مسٹر سید محمود صاحب نے یعقوب صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ سید محمود صاحب تو پرانے کانگریسی تھے۔ انہوں نے ایک مجلس قائم کی اور اس کا نام مجلس مشاورت دیا۔ قائم کرنے کا مقصد یہ بتایا کہ مسلمانوں کا فلاح اور ان کی ترقی۔

مجلس مشاورت کے ممبران پورے بہار میں مختلف جگہ جاتے اور مسلمانوں کو مجلس مشاورت کے فیور میں جمع کرتے۔

یعقوب صاحب مجلس مشاورت کے ایکٹو ممبر تھے۔ وہ پورے بہار کا دورہ کیا کرتے اور ہزاروں روپیہ لوگوں کی مہمان نوازی پر خرچ کرتے۔ خلاصہ یہ کہ یعقوب یونس صاحب نے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ لیکن آخر میں انہیں بڑی مایوسی ہوئی، جب سید محمود صاحب نے یہ اعلان کیا کہ مجلس مشاورت کے لوگ کانگریس کو ووٹ دیں۔ اب انہوں نے مجلس مشاورت کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ان کی شادی 1949 میں مہر صاحبہ (لکھنؤ) سے ہوئی۔ Ms. Mehr۔

1952 میں مسٹر یونس بیرسٹر یعنی یعقوب یونس صاحب کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اتنی بڑی جائداد اسے کون سنبھالتا، چنانچہ یعقوب صاحب پٹنہ آگئے۔ انہوں نے اپنی جائداد کو سنبھالا۔ وقت اور حالات کے بدلنے کے ساتھ Grand Hotel کا وقار بھی وہ نہ رہا جو کہ پہلے تھا، چنانچہ یعقوب صاحب نے گرینڈ ہوٹل کو گرینڈ اپارٹمنٹ میں بدل دیا۔ آج آپ کو اس کے اندر شاندار اپارٹمنٹ ملیں گے۔

یعقوب یونس صاحب کی زوجہ بھی انتہائی نیک اور شریف عورت تھیں۔ وہ بہت سمجھدار اور بیدار مغز بھی تھیں۔ وہ اپنے شوہر کو ضرورت سے زیادہ مانتی تھیں۔ میں بھی یعقوب صاحب سے ملنے برابر جایا کرتا تھا، تو بیگم صاحبہ دائی کے ساتھ میرے لئے چائے ضرور لاتیں۔ میں ان کا دل سے احترام کرتا تھا۔

یعقوب صاحب انتہائی سیکولر ذہن رکھتے تھے۔ مرتے وقت تک وہ اس کوشش میں لگے رہے کہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی وغیرہ کو ملا کر ایک سیکولر پلیٹ فارم بنا کر فرقہ پرستی کی مخالفت کی جائے۔ وہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے Old Boys Association کے Bihar Chapter کے President تھے۔

***

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ آپ نے دیکھے نہیں ہوں گے مگر، ہوتے تو ہیں!

اکیسویں صدی کی دو دہائیوں میں علی گڑھ کے بڑے انٹیلیکچولس کے نام، برترین دس نام، تلاش ہوا کرتے، اور ذہنی مشق چلتی ہوتی تو چند نام تو فوراً ہی سامنے آجاتے تھے۔ پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، پروفیسر جمال خواجہ، پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر احمد سورتی، پروفیسر نجات اللہ صدیقی۔ اور۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ باقی تین نام لوگ بتا ہی نہیں پاتے تھے۔ تلاش جاری رہی؛ آج بھی جاری ہے!

علی گڑھ کا آخری چندہ

اردو کے دو شریف ترین معاصروں آل احمد سرور اور احمد ندیم قاسمی نے سرسید کے آخری چندے پر یکساں طور سوچتے ہوئے ''ہماری زبان'' میں لکھا تھا کہ اورنگ زیب کی تدفین کو تو ٹوپیوں کی سلائی اور بغیر نام لکھے قرآن مجید کے چند اوراق کی کتابت کی مزدوری میں تدفین کے لئے ساڑھے تین روپے (بقول جدو ناتھ سرکار) جمع کر رکھے تھے، سرسید کی تدفین کے لئے تو ان کے ملازم کو چندہ کرنے کے لئے نکلنا پڑا تھا جس میں محسن الملک نے پہلا چندہ پچاس روپے دیا تھا۔

رشید احمد صدیقی کے خط خدا بخش میں

خدا بخش نے رشید صاحب کے خطوں کے کئی مجموعے چھاپے ہیں۔ آخری ڈاکٹر ذکیہ جیلانی کا مرتب کردہ وہ خطوط ہیں جو رشید صاحب نے شیام کرشن بھٹناگر صاحب کے نام لکھے ہیں، یہ خط اب تک غیر مطبوعہ تھے، اور ذکیہ مرحومہ کی تحویل میں چلے آتے تھے، جانے سے ایک آدھ سال پہلے اس مجموعے کو مرتب کر دیا، اور اردو والوں پر ایک بڑا احسان کر گئیں۔ بھٹناگر صاحب ہسٹری آف ایم۔ اے۔ او کالج کے مصنف تھے۔ کہتے تھے: Aligarh is running in my blood۔

اس سے قبل ڈاکٹر مسعود حسین خاں، رشید صاحب کے خطوں کا ایک مجموعہ رقعاتِ رشید صدیقی کے نام سے مرتب کر چکے تھے، جسے خدا بخش نے شائع کر دیا تھا۔ مسعود حسین خاں کا مرتب کردہ رشید صاحب کا ایک اور مجموعہ خطوط ''رشید احمد صدیقی کے کچھ خطوط، کچھ رقعات'' کے نام سے خدا بخش نے شائع کر دیا تھا۔ ایک خط اس مجموعے میں بڑے کام کا ہے، کبھی نقل ہوگا۔ اس میں یہ بھی ہے:

- ''اعلیٰ حضرت کلام بلاغت نظام پر چند صفحات لکھ لئے ہیں''، یہ اعلیٰ حضرت کون ہیں؟
- ع لاکھ ناداں سہی کیا مجھ سے بھی ناداں ہوں گے

یہ مصرع لکھ کر مومن کی طرف انتساب کر کے، پھر کسی کا ایک شعر لکھا ہے مگر شاعر کا نام نہیں لکھا (کوئی بتائے؟):

فلک کے ظرف کو اور باغباں کی طینت کو
چمن میں ایک نشیمن بنا کے دیکھ لیا

(ش)

***

سرسید کی خدمتِ اسلام

شریف (اور غیر شریف بھی) ہر کمیونٹی میں مل جاتے ہیں، شرافت کسی کی اجارہ داری نہیں۔ سید کو انگلستان کے بے حد مختصر قیام میں بھی ایک نہیں دو نہیں تین تین ایسے شریف مصنف ملے جو عیسائی تھے مگر اسلام کی سچائیاں لکھتے رہے۔

ہندستان کو ''فتح'' کر لینے کے بعد انگریزوں کی دوسری متوازی حملہ آوری کی کوشش جو پادریوں کے ذریعہ سے ہوئی، اس کا جواب سرسید نے سنہ 57 کے فوراً بعد سے دینا شروع کر دیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا حالی نے حیات جاوید میں سرسید کی ایک چٹھی گورنمنٹ کے نام نقل کی ہے، جس میں پادری لوگوں کی ان کوششوں پر روک لگانے کے لئے لکھا ہے۔

سرسید انگلستان گئے تو اپنے کالج کا نقشہ بنانے کے لئے آکسفورڈ اور کیمبرج کے ماڈل ہندستان میں لے آنے کی کوشش کے علاوہ وہ ایک کام یہ بھی کرتے رہے کہ اسلام کے خلاف یوروپ میں جو غلط سلط باتیں پڑھے لکھے طبقوں کی زبان میں چھوٹی سچی سنا تا جا رہا تھا، اس کے لئے وہ ہندستان ہی سے پلان بنا کر گئے تھے، اب انھیں کچھ اور ہمنوا یورپین بھی ایسے مل گئے جنھیں اسلام میں سچائی نظر آنے لگی تھی۔ سب سے پہلے تو انھوں نے اپنے دوست محسن الملک کو لکھا کہ اسلام کی ہمدردی میں ایک بہت اچھی کتاب ایک انگریز نے لکھی ہے، مگر غریب ہے، چھاپنے کی استطاعت نہیں رکھتا، ڈیوین پورٹ (Davenport) اس کا نام ہے، میرے برتن بھانڈے اور فالتو سامان بکواؤ، گھر میں پرانے چاندی کے ظروف رکھے ہیں، انھیں بکواؤ، اپنا اور دوستوں کا چندہ کروا اور جمع کر کے مجھے بھیجو، تا کہ یہ کتاب چھپوا دوں۔ یہ کتاب سرسید نے اپنے قیام کے زمانے میں ہی مذکورہ چندہ کر کے چھپوا دی تھی (جسے خدا بخش لائبریری نے ازسرِ نو شائع کر دیا)، سرسید نے دو اور کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے، ایک باسورتھ اسمتھ (Bosworth Smith) کی محمڈنزم، دوسرے ہیگنس (Higgins) کی Apology ان تینوں کتابوں کا وہ ترجمہ بھی چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک، **ہیگنس** کا ترجمہ کرا بھی دیا تھا، حمایتِ اسلام اس کا نام تھا۔ بریلی سے ۱۸۷۳ء میں شائع بھی ہوگئی تھی۔ ''*حسب الارشاد جناب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر CSI کے، **منشی عبدالودود صاحب نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔** بریلی (سے) مطبع صدیقی میں باہتمام مولوی محمد منیر مطبوع ہوئی*''۔ ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ کی مذکورہ اشاعت میں آخری صفحہ پر لکھا ہے:

''*اطلاع- یہ کتاب جناب مولوی سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی کے خاص خرچ سے ترجمہ و چھاپہ ہوئی ہے، اس لئے تمام حقوق معینہ ایکٹ ۲۰، ۱۸۴۷ء انھیں کی مِلک ہیں، اور انھوں نے اپنے تمام حقوق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی یعنی مجلس خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم للمسلمین کو دے دیئے ہیں، اور اب مالک ان حقوق کی وہ کمیٹی ہے۔ پس کوئی شخص بلا اجازت اس کمیٹی کے، اس کتاب کے چھاپنے کا مجاز نہیں*''۔ ہگنس کے ترجمہ کا نام ''حمایتِ اسلام'' تھا/ ہے۔

ہیگنس کی کتاب کا صدی ایڈیشن بھی چھپا۔ ۱۹۲۹ء میں صدی ایڈیشن کے طور سے مرزا ابو الفضل نے (م ۱۹۴۷ء) اسے زندہ کیا۔ یہ مرزا ابو الفضل بجا طور سے سرسید کے معنوی شاگرد رشید کہے جا سکتے ہیں، اسلام پر ان کی کتاب کا خدا بخش ایڈیشن، ''Islam: What It Is''۔

ہیگنس کی کتاب، مرزا ابو الفضل نے ایڈٹ کر کے صدسالہ یادگار کے طور سے ۱۹۲۹ء میں چھاپی تھی۔ اب، یونیورسٹی کی صدسالہ تقریب کے Finalé پر اس کتاب کا چرچا رہنا چاہیے۔ **(ایڈیٹر)**

***

منیر فرشوری

منیر فرشوری کی ایک پہچان تو یہ ہے کہ اتنی اچھی گفتگو کرنے والا کوئی علیگ ہی ہوسکتا ہے؛ یا پھر منیر فرشوری! دوسری پہچان یہ ہے کہ: یہ مصرعے تو آپ نے سن ہی رکھے ہوں گے:

ع جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

اور ع ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

مگر یہ شعر، جس کے بارے میں منیر صاحب کہتے ہیں کہ ان کے والد صاحب کا ہے (نہیں تو کس کا ہے؟)، بڑا زبردست شعر ہے:

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
میں جان گیا بس تری پہچان یہی ہے

منیر صاحب کی تیسری پہچان یہ ہے کہ ابھی تک فیصلہ نہیں ہوسکا کہ بہن کو زیادہ شعر یاد ہیں یا بھائی کو۔

فرشوری صاحب کے والد قمر الدین صاحب مرحوم ''بزم اکبر'' نامی مشہور کتاب کے مصنف تھے؛ ان کی ایک اور کتاب بھی ہے ''محفل عزیز''۔ بدایوں کے مشہور مصنفوں میں شمار ہوتے ہیں، جن کے صاحبزادے اور نواسے علی گڑھ کے اکابر میں ہیں۔

- **منیر فرشوری** کے دو زبردست شعر:

ہر دلعزیز ہونے کی خواہش تو تھی بہت
لیکن مرا ضمیر منافق نہ ہوسکا
یہ کعبہ بھی تو، پہلے تھا اک بت کدہ، **منیر**
اللہ! میرے دل کی بھی تقدیر بدل جائے

***

طارق

برِّ اعظم ہندوپاک میں سب سے پرچلت نام جو والدین کو پسند آیا، وہ نام طارق رہا ہے: فارسی کے طارق حسن، فلاسفی کے طارق اسلام، انجینئرنگ کے طارق جیلانی، جمال خواجہ خاندان کے طارق حسن، اور انگریزی قدیم کے طارق تو فوراً ہی یاد آ گئے؛ اور بھی ملیں گے۔

پچھلی صدی کے نصف اول میں پیرس سے جو انقلابی اٹھے تھے، ان میں سے ایک تو بعد میں سپریم کورٹ کے مشہور ایڈوکیٹ ہوئے، دانیال لطیفی؛ اور دوسرا کہیں پیرس کی گلیوں میں کھو گیا، نام تھا **طارق علی**۔

طارق کے نام پہ اب جبل الطارق تو کس کو یاد ہوگا، جبرالٹر چل گیا، اقبال نے البتہ اسے اپنے اشعار میں یاد رکھا:

''طارق نے جب سمندروں سے نکل کے اندلس (اسپین) کے کنارے پر قدم رکھا تو فوج کے اکابر کو حکم دیا کہ جن جہازوں پر ہم آئے ہیں، انھیں جلا دیا جائے، اس پر لوگ کہنے لگے ہمارے سردار کو کیا ہوگیا ہے، واپس کیسے جائیں گے۔ سردار تک بات پہنچی تو جواب ملا، واپس جانے کے لئے کون آیا ہے؟ ہر دیس ہمارا دیس ہے، کیوں کہ ہر دیس ہمارے اللہ کا دیس ہے۔

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چون رسیم
ترک سبب ز روی شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بشمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدای ماست

مگر علی گڑھ نے رشید صاحب کی زبانی اقبال کے شعروں کے برابر وزنی نثری شعر بھی لکھ دیئے تھے، دیکھیے کچھ وزنی تو لگیں گے:

''مجھے تو اس مسلمان جنرل کی ادا پسند آئی جس نے یہ عہد کیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا۔ فتح کرتے کرتے خشکی کا حصہ ختم ہوگیا تو اس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا اور کہا: بار خدایا: خشکی ختم ہوگئی، میرا عہد بھی ختم ہوتا ہے...... اللہ کے ساتھ اس کے سپاہیوں کا یہی معاہدہ ہوتا ہے''۔

ایک طارق نام، علی گڑھ والوں کے لئے بھی پچھلے چار پانچ سال سے مانوس ترین نام رہا ہے، ہر وائس چانسلر نے علیگڑھ کو کوئی اہم یوگدان ضرور دیا ہے، آج کے وائس چانسلر نے بھی اپنی حد تک کوشش تو کی ہے!

ہر لحظہ نیا طور، نئ برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

***

علی گڑھ کی جامعہ ملیہ سے ترقی پسند ادب و فکر کا آغاز

از پروفیسر رضی الدین احمد مرحوم، تروپتی

یہ اس وقت کی بات ہے جب علی گڑھ سے ایک ترقی پسند گروپ نکل کے علی گڑھ میں باغی فکر کی بِنا ڈال رہا تھا۔

''حیات حافظ'' اور ''حیات جامی'' دونوں میں جس طرح مولانا اسلم جیراجپوری نے انسان کے ذوقِ جمال پر بحث کی ہے وہ بڑی حقیقت شناسی اور تاریخی ترقی پسندی کی مثال ہے۔ یہی وہ حقیقت پسندی اور ترقی پسندی تھی جسکی بنا پر مدتوں بعد ترقی پسند تحریک کے رہنما سجاد ظہیر نے بھی ''حیات حافظ'' پر اسی انداز سے بحث کی۔ اور یہ بتایا کہ حافظ کی حسن پسندی اور انسانی فطرت میں تنوع کا پایا جانا عین انسانی فطرت ہے جو اسے حیوانات سے ممتاز اور منفرد کرتی ہے۔ اردو کی ترقی پسند تحریک کا یہ بڑا المیہ ہے کہ اس نے اردو کی ترقی پسند تحریک کو یا تو انگارے سے شروع کیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انگارے سے 16 برس پہلے جب علیگڑھ میں ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کا آغاز ہوا تو یہ ایک تحریک تھی جو سرتا سر ترقی پسند تحریک تھی۔ یہ اُن انقلابی طالب علموں کی تحریک تھی جنھوں نے گاندھی جی کی تحریک پر سرکاری مدرسوں کو چھوڑ کر حکومت سے عدم تعاون کیا تھا۔ اور عدم تعاون ہی سے تحریک آزادی کو آزادی کی منزل تک پہنچایا تھا۔ ایک مکمل ترقی پسند تحریک کو یکسر نظر انداز کرنا تنگ نظری ہے جس کی ترقی پسندی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب ہندوستانی طلبا اعلیٰ تعلیم کے لئے یوروپ گئے اور وہاں انہوں نے یوروپ کے طالب علموں اور عالموں سے آزادی اور مساوات جیسے اہم موضوعات پر بحث کی تو ترقی پسندی کا ایک تصور ان کے سامنے آ گیا۔ یہ تین ہندوستانی طالب علم ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب ایسے ذہین اور ترقی پسند طالب علم تھے کہ جنھوں نے علیگڑھ اور دوسرے سرکاری اداروں کو چھوڑ کر پہلی بار اعلیٰ تعلیم کا ایک ترقی پسند ادارہ بنانے کی کوشش کی۔ اس ادارے میں ہندوستان کے تمام سیاسی رہنما شامل تھے، تمام دانشور شامل تھے، تمام ادیب اور شاعر شامل تھے۔ یہ وہ ترقی پسند ادارہ تھا کہ جس نے ناول اور افسانہ تک ترقی پسندی کو محدود نہیں کیا تھا بلکہ مذہب، تعلیم، سیاست، معاشیات، سماجیات اور پوری سماجی زندگی کے وسیع دائرے میں ترقی پسندی کا جائزہ لیا تھا۔ ان انقلابی طالب علموں نے صرف افراد تک ہی نہیں بلکہ ادارے کی بنیاد پر ترقی پسندی کی تاریخ کا آغاز کیا تھا۔ اِس ادارے کے تمام کارکن، تمام طالب علم، تمام اساتذہ، تمام ہمدرد ایسے تھے کہ جن میں ترقی پسندی قدرِ مشترک تھی۔ ایک ادارے کو، ایک تحریک کو، ایک تنظیم کو اس طرح نظر انداز کرنا ترقی پسندی کے سراسر منافی تھا۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ نہ صرف ترقی پسندوں کے حامیوں نے یہ تاریخی غلطی کی، بلکہ اس تحریک کے مخالفوں نے بھی ٹھیک اسی غلطی کا ارتکاب کیا، کہ انہوں نے سب سے پہلے، سب سے بڑے اور سب سے معیاری ادارے کو نظر انداز کر کے خود ترقی پسندی کے وسیع دائرے کو تنگ کر کے، ترقی پسندی کو بطور تحریک کے کمزور کر دیا۔ اور جس ترقی پسندی کو سراہا وہ محض ایک فیشن تھا، نہ کہ مشن۔ جامعہ کے تمام اساتذہ چاہے وہ مذہب کے عالم ہوں جیسے علامہ اسلم جیراجپوری یا تعلیم کے ماہر ہوں جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین، یا فلسفے کے عالم ہوں جیسے ڈاکٹر عابد حسین، یا تاریخ اور تہذیب کے دانشور ہوں جیسے پروفیسر مجیب، ان سب کو نظر انداز کر کے ترقی پسند تحریک کا تصور کرنا نہایت غیر علمی رویہ ہے۔ (غیر مطبوعہ)۔

(ماخوذ از ''مفسر، محقق اور مؤرخ علامہ اسلم جیراج پوری''، از پروفیسر رضی الدین احمد مرحوم، تروپتی)۔

***

علی گڑھ کے ۲۰ویں صدی کے آخری چانسلر، حکیم عبدالحمید

حکیم عبدالحمید کو سرسیدِ ثانی کہا گیا، اور بار بار کہا گیا۔

سرسید سمجھتے تھے، مسلمانوں میں جب تک تعلیم نہ پھیلے، وہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔ اس کے لئے انہیں سیاست اور خاص طور سے احتجاج کی سیاست کو چھوڑنا ہوگا۔ حکیم صاحب نے بھی تعلیم پر ویسا ہی زور دیا مگر اس فرق کے ساتھ کہ سرسید کے زمانے میں نئی تعلیم اور نئی تہذیب کو اپنی تہذیب و تاریخ سے ملا کر نئی نسل پیدا کرنی تھی جو ذہنی طور سے اتنی ترقی کر لے کہ یوروپی ذہن اور ہم وطنوں کے ذہن کے مماثل ہو سکے۔ اور:

حکیم صاحب تک پہنچتے پہنچتے یہاں تعلیم پر زور تو اسی طور پر تھا مگر ایک فرق کے ساتھ: کہ ۴۷ کے بعد کی حیران و پریشان قوم کو روزگار کی سہولت ہو جائے۔ جب پیٹ بھریگا تو آگے ذہنی تربیت بھی ہوتی جائے گی، اس نسل کی نہ سہی، اگلی نسل تو اس لائق ہو ہی جائے گی کہ کھلی فضا میں سانس لے سکے اور سوچنے والے ذہن پیدا کر سکے۔

تعلیم سے ہٹ کے سرسید نے مسلمانوں کی ذہنی تربیت کے لئے بھی جان لڑا دی بلکہ اپنی عزت اور شہرت بھی داؤ پہ لگا دی۔ وہ اوہام پرستی، اور قدامت پسندی کی ہر سوچ کو بدلنا چاہتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے پہلے اپنا گزٹ اور پھر رسالہ تہذیب الاخلاق نکالا جس سے قوم میں عقلیت پسندی اور جستجو کا مادہ پیدا ہو۔ پھر قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ حکیم صاحب نے مذہب کو نہیں چھیڑا۔ نہ قران و حدیث کے بارے میں کچھ کہا۔ خاموشی سے ایک فرنٹ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی: یعنی تعلیم بھی برائے روزگار۔ حتی کہ **اسلامک اسٹڈیز** کا شعبہ بھی قائم تو بھلے ہی کر دیا، مگر پہلی فرصت میں اسکو لپیٹنے میں بھی کوئی تاخیر نہیں کی۔ بڑی بڑی اسکیمیں تھیں اسے دنیا کا ایک بڑا ادارہ بنانے کی۔ مگر آخر کو بس اک جوئے کم آب ہو کے رہ گیا۔ اصل ہدف تو یونیورسٹی کا قیام ہی تھا سو وہ اپنی زندگی میں حاصل کر گئے۔ یہ نہیں کہ وہ صرف **مسلمانوں** کے ہی بارے میں سوچتے تھے۔ **سچ یہ ہے کہ اسلام** سے بھی انہیں ایسا ہی شغف تھا۔ اسلامی قانون اور شریعت کو آج کے حالات میں کیسے جدیدیت سے ہمکنار کیا جائے، اسکے لئے وہ بے چین رہتے تھے۔ اس بے چینی کی ایک تجسیم، طاہر محمود صاحب، دیر تک انکے اس ہدف کے حصول کے لئے، انکا ساتھ دیتے رہے۔ مسلکوں کی آپسی آویزش سے وہ بڑے دکھی تھے۔ اسکیم بنائی اور ایک ابتدائی نقشہ بھی بنایا کہ سارے اسلامی فقہوں سے عبادات و معاملات کا ایک ایک مسئلہ لیکر ہر معروف فقہ کے احکام چھ سات ضروری خانوں میں تقسیم کر کے، اور ہر رائے کو برابر کا وزن دیکے ایک مجموعہ مرتب ہو جائے۔ جب ان سے کہا گیا کہ جس فقہ کا جس معاملۂ خاص میں ترجیحی درجہ ہو، اسے بھی ہماری طرف سے واضح کر دینا چاہیے، تو بولے، ارے نہیں **وہ** مجھے مار ڈالیگا۔ شاید وہ ٹھیک ہی تھے کہ وہاں تک لا کے چھوڑ دو اور باقی سب عقل کی صوابدید پر رہے۔

شیعہ سنی مسلکوں میں دوری بھی ناپسند تھی، شاید انکا بھی **ردولوی** انداز فکر تھا۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے انکے پاس جو جو نسخے تھے، حکیم تھے تو نسخے بھی ہوں گے، وہ انہوں نے، سب جمع کر رکھے تھے۔ سو ان کی اس میراث کی بنیاد پر یہ دوریاں اور فاصلے دور کرنے کی قرابادین کی طرف ہماری آپ کی ملی جلی توجہ ہو جائے تو بیڑا پار ہے۔

***

Aligarh Diaspora - 2

Launched to mark the Finalé (December'21) of AMU Centenary Celebrations 2020-21

Aligarh Speaks to the Nation, for the Nation

in 2010 - *by* Prof. P.K. Abdul Azis, *Vice-Chancellor (2007-2012)*

All India Character of Aligarh has been Revived : One of the historic initiatives is that the AMU has decided to establish five special centres at Katihar (Bihar), Murshid--aabad (West Bengal), Mallapuram (Kerala), Bhopal (Madhya Pradesh) and Pune in Maharashtra. The Government of India has accepted the proposal in principle and has advised the University to contact the respective state governments to complete the formalities including acquiring land free of cost. West Bengal has agreed to give three hundred fifty acres of land, Kerala government has informed the University that it is ready to dispense with four hundred acres of land in Mallapuram District, and the Chief Minister of Bihar has announced that the required land would be provided for the AMU. The responses from other state governments are awaited. The idea is to establish the Aligarh Model so as to take the Sir Syed Movement to different parts of the country. The existing laws regarding the establishment of off campuses and special centres away from the main campus are highly ambiguous. They can be interpreted either way. But we have taken a very proactive view of the provisions.

MauJana Azad Library : A digital resource centre in Maulana Azad Library has been established wherein hundreds of journals are available online and hundreds of CDs have also been made available. Students can access innumerable journals online any time of the day. By June this year the main campus and the other campus will be networked and linked together.

Apart from these facilities, Maulana Azad Library would soon have a separate block equipped with fully air-conditioned modern facilies for keeping the manuscripts. An audi--torium and digital facility inside the Library building are also proposed.

AMU Schools : Proposals for upgradation and modernization of its Schools has also been accepted. These schools would get affiliation from Central Board of Secondary Education (CBSE). More than one hundred regular teachers would be appointed in these schools to improve the academic standard.

On the Aligarh Declaration 2009 Relaunching the Aligarh Movement: The background of Aligarh Declaration is that AMU established a special centre 20 year ago for the Advancement of Muslims of India. But unfortunately even after such a long time it was unable to launch a nationwide campaign for the advancement. So, when I took charge I found a window of opportunity to sensitize our people. This led to the idea of organizing a national seminar on minority education to take stock of the status of education of Muslims in the country. The chief idea was to assess the role played by Muslim NGOs in the field of education. Another objective was to gauge the gap in other states and then to analyse whether the success stories could be replicated in Northern education-deficient states particular--ly in Muslim concentration areas as identified by the Sachar Committee as well. In the said national seminar eight Muslim NGOs presented their success stories. After debating for two days the people from different regions felt that there has to be taken a united effort at the all India level, and prepared a national plan known as the Aligarh Declaration 2009.

It is basically the picking-up of the Aligarh Movement. After Sir Syed and his companions *left* this world there was nobody to take it as a Movement. Aligarh remained as a cradle of education. Unfortunately the Muslims of India could not replicate it. In fact nobody ever thought of establishing a University albeit a variety of reasons. The purpose of the Aligarh Declaration is that education should be only in the hands of Muslims. The Declaration aims that by 2020 the Muslim community should attain hundred per cent literacy, and hundred per cent primary and matriculation education.

Reservation for Muslims : Reserv--ation should have been done right from day one after partition. Muslims should have been given reservation in all of the areas of education and employment because then only the balanced growth is possible as part of the social engineering. This is the only way to ensure that every one feels that he she is part of the nation building process. In my opinion reservation is key to Muslim empowerment. However, I suggest that Muslims should be given reservation for a certain period so that they can come on par with other communities as well. In every area where public money is spent Muslims should be given reservation.

Generous Grants from the Govt. of India : When I took charge of the University most of the funds given under the Tenth Plan were about to be lapsed. My request to the UGC for utilizing the unused funds was granted under special circumstances. The UGC activated its mechanism and all of the contracts are now given to the Central Public Works Department (CPWD). All of these projects are slated to be completed by June this year only. Not this.UGC sanctioned additional funds - more than three times — for the University.

Aligarh Students basically very loving and caring : If they are given the right type of mentoring then they are sure to do exceptionally well. The institution of Aligarh Muslim Univer--sity is really great. The training and values that are inculcated in the Minds of the students are very good. The students who have left the University some 10 or I5 years ago have made their mark wherever they have gone.

***